دینی و دنیوی تعلیم کا سنگم

قرآن کالج لاہور

الیف اے اور آئی کام میں داخلے شروع ہیں

داخلہ فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ 31 جولائی 98ء ہے

نتیجہ کے منتظر طلبہ بھی درخواست دے سکتے ہیں

رابطہ کیجئے : پرنسپل قرآن کالج' 191۔ اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

ممتاز عالم دین **ڈاکٹر اسرار احمد** امیر تنظیم اسلامی

کی تالیفات' خطابات اور دروس قرآن مجید میں سے

دو تعارفی سیٹوں کا انتخاب مع مکمل فہرست کتب و کیسٹ

10 کتب کا سیٹ (رعایتی قیمت -/65)

1- اسلام کا معاشی نظام 2- راہ نجات
3- فرائض دینی کا جامع تصور
4- نظام خلافت کے خدوخال 5- عزم تنظیم
6- دعوت الی اللہ 7- تنظیم اسلامی کی دعوت
8- نبی اکرم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں
9- مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق
10- اسلام میں عورت کا مقام

5 کیسٹس کا سیٹ (رعایتی قیمت -/125)

1- امت مسلمہ کے زوال کے اسباب
2- عظمت قرآن مجید
3- ہمارا دین ہم سے کیا چاہتا ہے؟
4- نیکی کا حقیقی تصور
5- پاکستان میں نظام خلافت کے قیام کا لائحہ عمل

نوٹ: یہ سیٹ پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں تنظیم اسلامی کے مقامی دفاتر سے حاصل کیے جاسکتے ہیں مرکزی دفتر سے بذریعہ وی پی یا منی آرڈر طلب کیے جاسکتے ہیں۔ (ڈاک خرچ بذمہ ادارہ)

تنظیم اسلامی پاکستان' 67/A علامہ اقبال روڈ گڑھی شاہو لاہور فون 6305110 / 6316638

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا
(البقرہ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارہ تحریر: حافظ خالد محمود خضر، پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۱۷ | ربیع الثانی ۱۴۱۹ھ — اگست ۱۹۹۸ء | شمارہ ۸

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے۔ ماڈل ٹاؤن۔ لاہور ۱۴- فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱داؤد منزل متصل شاہ بخاری۔ شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون -/۸۰ روپے، فی شمارہ -/۸ روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حرف اول

ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس۔ نظام الاوقات میں تبدیلی

اس سال قرآن اکیڈمی کے زیر اہتمام ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس کے اجراء کو دس برس مکمل ہو گئے ہیں۔ الحمد للہ کہ پچھلے دس برسوں میں یہ کورس باقاعدگی سے جاری رہا اور قریباً ہر شعبہ زندگی سے وابستہ تعلیم یافتہ اور باشعور حضرات نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ان میں ڈاکٹر اور انجینئر بھی تھے، گریجویٹس اور پوسٹ گریجویٹس بھی، کاروباری اور ملازمت پیشہ افراد بھی تھے اور عمر رسیدہ اور ریٹائرڈ، بالخصوص ریٹائرڈ فوجی آفیسرز بھی۔ کورس کے شرکاء کی تعداد اس دوران گھٹتی بڑھتی رہی۔ کسی سال اگر شرکاء کی تعداد پچاس سے متجاوز رہی تو ایسے مواقع بھی آئے جب بیس سے بھی کم افراد شریک کلاس ہوئے۔ بہرکیف یہ کورس تسلسل کے ساتھ جاری رہا۔

یہ کورس دو سمسٹرز میں منقسم ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے چونکہ امریکہ میں مقیم ہمارے رفقاء اور احباب کے حلقے میں سے بھی ہر سال تین چار افراد اِس کورس میں شرکت کے لئے تشریف لاتے رہے ہیں لہٰذا اُن کی سہولت کے پیش نظر کورس کے دورانیہ کو مزید گھٹا کر ۹ ماہ تک محدود کر دیا گیا ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ زیادہ intensive study کے ذریعے کم عرصے میں کورس کو مکمل کر دیا جائے ـــــ ہر سمسٹر کا دورانیہ قریباً سوا چار مہینے ہے اور درمیان میں دو ہفتے کا بریک ہے ـــــ پہلے سمسٹرز کا بنیادی اور مرکزی مضمون عربی گرامر ہے جس کے ساتھ قرآن حکیم کی فکری و عملی رہنمائی پر مشتمل "منتخب نصاب" کو بھی اس سمسٹر کے ایک اہم مضمون کی حیثیت حاصل ہے۔ مزید برآں تجوید، مطالعہ تحریکی لٹریچر اور مطالعہ حدیث بھی شامل نصاب ہیں۔ جبکہ دوسرے سمسٹر میں "ترجمہ قرآن حکیم" مرکزی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے جس کے ساتھ ساتھ مبادیات فقہ، اصطلاحات حدیث و مطالعہ حدیث اور بعض دیگر اہم مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں۔

اس سال ماہ رواں کے آخر تک اس کورس میں داخلے مکمل کر لئے جائیں گے اور ان شاء اللہ العزیز ۷ / اگست سے تدریس کا آغاز ہو جائے گا۔ گزشتہ برسوں کے مقابلے میں اس سال ایک ماہ کی تعجیل سے اس کورس کا آغاز کیا جا رہا ہے اور اس کا اختتام مئی ۹۹ء کے اواخر میں ہو جائے گا۔ قبل ازیں اکتوبر کے پہلے ہفتے میں تدریس کا آغاز ہوتا تھا اور اگلی جولائی اگست تک تدریس کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ نظام الاوقات میں یہ تبدیلی شدید موسمی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کی گئی ہے۔

"شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے"

نبیِّ اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

اور اہلِ پاکستان کی ذمّہ داری

محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے خطاب جمعہ کی تلخیص

حمد و ثنا' تلاوت آیات اور ادعیہ ماثورہ کے بعد :

نبی اکرم ﷺ کا مقصد بعثت غلبۂ دین حق ہے۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے : ﴿ هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ﴾ یہ الفاظ مبارکہ سورۂ صف' سورۂ فتح اور سورۂ توبہ میں بھی وارد ہوئے ہیں۔ حضورؐ کا یہ مقصد بعثت کفار کی تمام تر ریشہ دوانیوں کے باوجود مکمل ہو کر رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ ﴿ یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ ﴾ - یہ بات کئی مرتبہ بیان کی جا چکی ہے کہ غلبۂ دین حق کے دو مراحل ہیں۔ مرحلہ اول کی تکمیل تو خود حضور ﷺ نے اپنے دست مبارک سے فرما دی' آپ نے بنفس نفیس جزیرہ نمائے عرب کی سرزمین پر دین کو غالب کر دیا۔ چنانچہ قرآن مجید میں اس کی وضاحت اور صراحت کر دی گئی کہ ﴿ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴾۔ بعد ازاں خلافت راشدہ کے عہد میں اسی غلبۂ دین کے عمل میں توسیع ہوئی' جبکہ خلافت راشدہ کے بعد اس میں رفتہ رفتہ زوال آتا گیا۔ جہاں تک غلبۂ دین کے عمل کے تکمیلی مرحلے کا تعلق ہے اسے ابھی پورا ہونا ہے اور یہ لازماً ہو کر رہے گا' وہ دن آ کر رہے گا جب کل روئے ارضی پر اللہ کا دین غالب ہو گا اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام پورے عالم پر نافذ ہو گا۔

قرآن مجید کے فلسفۂ تاریخ کے اعتبار سے تاریخ انسانی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا

سکتا ہے۔ ایک مرحلہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک کا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان اور پہلے نبی تھے جبکہ حضرت محمد ﷺ پر نبوت کا اختتام بھی ہو گیا اور رسالت کی تکمیل بھی۔ تاریخ انسانی کے اس عہد میں دو ارتقاء ساتھ ساتھ اور متوازی طور پر وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ انسان کا ذہنی و عمرانی ارتقاء اور نبوت و رسالت کا ارتقاء ساتھ ساتھ جاری رہے ہیں' یہاں تک کہ نبوت و رسالت کا سلسلہ ترقی کی منازل طے کرتا ہوا محمد رسول اللہ ﷺ پر پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔ تاریخ انسانی کے دوسرے دور کا آغاز حضرت محمد ﷺ سے ہوتا ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔ ایک حدیث مبارکہ میں خود حضور ﷺ نے اپنی بعثت اور قیامت کو دو انگلیوں کی طرح جڑا ہوا قرار دیا : ((بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَۃُ کَھَاتَیْنِ))۔ اس لئے کہ آپؐ کی آمد کے بعد نبوت ختم اور رسالت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی' تاہم اس ارتقاء کا ایک مرحلہ ابھی باقی ہے' وہ ارتقاء جو پہلے طبعی و مادی تھا پھر حیاتیاتی سطح پر ہوا' پھر ذہنی و فکری سطح پر ہوا اور پھر سماجی سطح پر ہوا' اس کی انتہا حضور ﷺ کے عطا کردہ نظام کا پورے کرۂ ارضی پر غلبہ ہے۔ انسان کے ذہنی اور تہذیبی ارتقاء کا نقطۂ عروج بعثت محمدیؐ ہے جس کا تکمیلی مرحلہ پوری دنیا پر دین محمدیؐ کا غلبہ ہے۔ نوع انسانی کے لئے اس سے اونچا مرتبہ و مقام اور کوئی نہیں ہے۔ بقول اقبال :

آیۂ کائنات کا معنی دیریاب تو
نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بُو

یعنی کائنات میں ارتقاء کا جو عمل مسلسل جاری ہے اس کا مقصود و منتہی ذات محمدیؐ ہی ہے۔ گویا پوری کائنات کو اگر ایک آیت قرار دیا جائے تو اس آیت کا معنی اور مقصود ذات محمدیؐ ہی قرار پائے گی۔ اس لئے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام انبیاء و رسل کو نبوت و رسالت محمدیؐ کے لئے تمہید کی حیثیت حاصل تھی کیونکہ ارتقاء کے عمل میں ہر پہلی کڑی اگلی کڑی کے لئے تمہید بنتی ہے۔ حضور ﷺ کی بعثت کے ذریعے انسانی ارتقاء کا ایک مرحلہ اپنی تکمیل کو پہنچ گیا' لیکن حضور ﷺ کے لائے ہوئے نظام حیات کا پورے کرۂ ارضی پر غلبہ ابھی باقی ہے۔

"ظہورِ قدسی" کے حوالے سے سورۂ مدثر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ آپؐ کی

نبوت کا ظہور سورۂ علق کی ابتدائی پانچ آیات سے ہوا ہے۔ لفظ "ظہور نبوت" پر توجہ کی ضرورت ہے' اس لئے کہ نبی تو پیدا ہوتے ہی نبی ہوتا ہے' انبیاء و رُسل عالم ارواح میں بھی نبی اور رسول ہی تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا : ((كُنْتُ نَبِيًّا وَ آدَمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّيْنِ)) "میں اُس وقت بھی نبیؐ تھا جب آدم ابھی مٹی اور پانی کے مابین تھے"۔ لہٰذا حضورؐ کی نبوت کا ظہور سورۂ علق کی آیات سے ہوا تھا۔ آغاز رسالت سورۂ مدثر کی آیات سے ہوا۔ اس سورۂ مبارکہ کی ابتدائی تین آیات زیر بحث موضوع کے اعتبار سے نہایت اہم ہیں۔ فرمایا گیا ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ○ قُمْ فَأَنْذِرْ ○ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ اے لحاف میں لپٹنے والے انسانؐ! یہ غور و خوض اور تفکر و تدبر کا مرحلہ اب ختم ہو چکا ہے' لہٰذا اب کھڑے ہو جاؤ اور لوگوں کو خبردار کرو کہ یہ دنیا ایک دھوکہ اور سراب ہے' اس کی حقیقت کچھ نہیں' ایسا نہ ہو کہ کل کو "جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا" جیسا معاملہ ہو جائے۔ لہٰذا لوگوں کو ان کے انجام سے خبردار کرو ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

یہ ہے انذار جہاں سے نبی کی دعوت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس دعوت کا ہدف کیا ہے؟ فرمایا گیا ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ "اور اپنے رب کی کبریائی قائم کرو"۔ لفظی ترجمہ ہو گا کہ رب کو بڑا کرو! رب حقیقت میں تو بڑا ہے لیکن دنیا میں اس کی بڑائی کو تسلیم نہیں کیا جا رہا۔ انسان اپنے ذہن و فکر اور اپنی مرضی کا غلبہ چاہتا ہے اور اپنی حاکمیت کا مدعی ہے' جسے آج حاکمیت عوام کا نام دے دیا گیا ہے کہ ہم خود اپنی مرضی چلائیں گے' اپنے لئے من پسند قوانین بنائیں گے۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ ہم نے اللہ کی ہستی کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا اور اگر کچھ لوگ تسلیم کرتے بھی ہیں تو انہوں نے اللہ کو مسجدوں' مندروں اور کلیساؤں تک محدود کر دیا ہے۔ اپنی مارکیٹ سے' سٹاک ایکسچینج سے' عدالت سے' مالیاتی اداروں سے' پارلیمنٹ سے' ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ حتیٰ کہ اپنے گھروں سے بھی باہر نکال رکھا ہے۔ ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ کے مصداق اس ہمہ گیر بغاوت کو ختم کرنا اور اللہ کی بڑائی قائم کرنا تاکہ اس کا قانون بالاترین قانون بن جائے' ﴿لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ

هِیَ الْعُلْیَا﴾ تاکہ اسی کی بات سب سے بلند ہو جائے' سب سے اونچی ہو جائے' اس کے حکم کے آگے کسی کا حکم نہ چلے' اس کے قانون کے مقابلے میں کوئی قانون مؤثر نہ رہے' اس کے فیصلے کے مقابلے میں کوئی فیصلہ مؤثر نہ رہے۔ یہ کیفیت اگر معاشرے میں پیدا نہیں ہوتی تو پھر یہی بغاوت ہے جسے ختم کرنا بعثت محمدیؐ کا مقصد ہے۔ "تکبیر رب" کے حوالے سے اسی موضوع کو علامہ اقبال نے یوں شعر کا جامہ پہنایا ؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مسلکِ مردانِ خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات

اللہ کی تسبیح و تقدیس کی اس کائنات میں کمی تو نہیں ہے' ہر چیز اس کی تسبیح کر رہی ہے مگر انسان کو تو خلافت کا منصب عطا کیا گیا ہے۔ انسانوں اور جنوں کی غایت تخلیق اللہ کی عبادت و بندگی ہے' جیسے فرمایا گیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾

"ظہورِ قدسی" کے حوالے سے اسی سورۂ مدثر کی آیات میں پورے فلسفہ تاریخ کا تعلق بعثت محمدیؐ سے جڑ جاتا ہے۔ ﴿کَلَّا وَالْقَمَرِ ۝ وَالَّیْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۝ وَالصُّبْحِ اِذَا اَسْفَرَ ۝﴾ "کوئی نہیں' میں قسم کھاتا ہوں چاند کی' اور قسم ہے رات کی جب کہ وہ جانے لگے' اور قسم ہے صبح کی جب کہ وہ روشن ہو جائے"۔ بے شک بعثت محمدیؐ عظیم واقعات میں سے ایک واقعہ ہے' اسے معمولی نہ سمجھئے۔ دنیا میں مروج پیمانوں کے اعتبار سے تو یہ کوئی بڑا واقعہ نہیں تھا۔ حجاز کے ایک چھوٹے سے گھر میں ایک بیوہ خاتون کے ہاں ایک یتیم بچے کی ولادت کا ہونا بظاہر کوئی بڑی بات نہ تھی۔ لیکن بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ بعثت محمدیؐ سے تاریخ انسانی کا عظیم ترین واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ یہاں چاند کی قسم کیوں کھائی گئی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ چاند کا نور ذاتی نہیں ہے بلکہ سورج ہی سے مستعار ہے۔ چودھویں کا چاند بھی نصف النہار کے سورج کی طرح نہیں ہو سکتا۔ بالکل اسی طرح سابقہ تمام نبوتیں اور رسالتیں چاند سے مشابہ ہیں جبکہ نبوت و رسالت محمدیؐ خورشید کے مانند ہے۔ کچھ راتیں ایسی بھی آتی ہیں جن میں چاند کی روشنی

بھی کم ہو جاتی ہے اور اندھیرا سا ہو جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سے لے کر حضور ﷺ کی بعثت تک کا عرصہ انسانیت کے لئے انہی تاریک راتوں کے مانند ہے جن میں نبوت و رسالت کی روشنی سے پوری دنیا محروم رہی' اس چھ سو سال کے وقفے کو اصطلاحاً "فَتْرَةُ الْوَحْيِ" کہتے ہیں۔ اس چھ سو سالہ تاریک رات کے بعد خورشید محمدیؐ طلوع ہوا جس نے پورے عالم انسانیت کو منور کر دیا۔ ابوجہل اور ابولہب کے تمام تر ہتھکنڈوں اور قریش اور یہود کی ہر قسم کی مخالفتوں کے باوجود اللہ نے اپنے نور کو مکمل فرما دیا ﴿وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ اور روشن صبح کی طرح نورِ خداوندی کا ذنیا میں اُجالا ہو گیا۔ بقول علامہ اقبال ؎

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!!

محمد رسول اللہ ﷺ کو پوری نوع انسانی کے لئے نذیر و بشیر بنا کر معبوث کیا گیا ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾۔ بعثت محمدیؐ کا دائرہ کسی قبائلی حد یا کسی ملک کی سرحد تک محدود نہیں ہے۔ کوئی جغرافیائی اور قومی سرحد اس پیغام کے راستہ میں حائل نہیں۔ بعثت محمدیؐ کا سورج طلوع ہو چکا ہے' اب اس خورشید سے خود کو اور دوسرے انسانوں کو منور کرنے کے لئے کون آگے بڑھتا ہے اور کون پیچھے رہ جاتا ہے' یہ ہر شخص کا انفرادی فیصلہ ہے۔ ابوبکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم آگے بڑھ گئے اور ابوجہل' ابولہب' عتبہ اور عتیبہ پیچھے رہ گئے۔ اللہ کے ذمہ تو راستہ سجھا دینا تھا' وہ اس نے سجھا دیا' اب شکر گزاری یا کفران نعمت کی روش اختیار کرنے کی ہر ایک کو کھلی آزادی ہے۔ جب تک پوری دنیا پر دین حق کا غلبہ مکمل نہیں ہو جاتا اُس وقت تک بعثت محمدیؐ کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ جس طرح سابقہ تمام نبوتیں اور رسالتیں رسالت محمدیؐ کی تمہید تھیں بالکل اسی طرح احیائے اسلام کے لئے ہماری محنت اور قربانی بھی بعثت محمدیؐ کی عالمی سطح پر تکمیل یعنی عالمی سطح پر اسلام کے غلبہ کی تمہیدی کڑی قرار پائے گی۔ جو جماعتیں اور افراد غلبۂ دین کے لئے محنت کریں گے یہ سب محنت اسی ایک جگہ جمع ہو جائے گی۔

بعثت محمدیؐ کے بعد دنیا میں کبھی تاریکی نہیں آ سکتی' البتہ دنیا پر دھندلکا سا آ گیا ہے۔

حضور پر نبوت ختم ہو گئی اب قیامت تک کسی شخص کو نبوت نہ ملے گی۔ غور کا مقام ہے کہ نبوت تو بہت بڑی رحمت اور نعمت ہے۔ اگر یہ ختم ہو گئی تو اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے بھی کچھ چیزیں ہونی چاہئیں۔ چنانچہ اس خلاء کو رب العزت نے تین چیزوں سے پُر کیا ہے :

۱) قرآن کریم۔ یہ ہدایت کاملہ کے طور پر ہمیشہ موجود رہے گا۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے' یہ کبھی ضائع ہو گا نہ اس میں تحریف ہو گی۔ ہر طالب ہدایت اور ہر طالب حقیقت کے لئے ہر وقت اور ہر زمانے میں آسانی سے دستیاب رہے گا تاکہ وہ اسے پڑھے اور اس سے ہدایت حاصل کرے۔

۲) ہر صدی میں اللہ تعالیٰ ایسے مجدد اٹھاتا رہے گا جو دین کو تازہ کرتے رہیں گے۔ سنن ابی داود کی روایت ہے : ((اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ فِی ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأْسِ کُلِّ مِائَۃِ عَامٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا)) ''اللہ تعالیٰ اِس اُمت میں ہر صدی کے سرے پر ایسے لوگوں کو کھڑا کرتا رہے گا جو اس اُمت کی خاطر دین کو تازہ کریں۔''

۳) حق پرست لوگوں کا ایک گروہ ہر وقت اُمت میں موجود رہے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا : ((لَا تَزَالُ فِی اُمَّتِی طَائِفَۃٌ قَائِمِیْنَ عَلَی الْحَقِّ)) ''میری اُمت میں ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔''

پس قرآن کی محفوظیت' ہر سو برس کے فاصلے پر صاحب عزیمت اور صاحب ہمت شخصیات کا پیدا ہونا جو دین کی صحیح صحیح تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کریں اور ایک حق پرست گروہ کا ہمہ وقت موجود رہنا' یہ تینوں چیزیں مل کر اُس خلا کو پُر کرتی ہیں جو سلسلۂ نبوت کے ختم ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ یہ تین ضمانتیں وحی کا بدل ہیں۔ ان تین چیزوں سے وحی نبوت کے خلاء کو ایک حد تک پُر کر دیا گیا ہے۔

ایک ہزار برس میں اسلام کی عظیم الشان عمارت میں رفتہ رفتہ تنزل رونما ہوتا چلا گیا' چنانچہ برعظیم پاک و ہند میں دینی اعتبار سے دورِ تنزل کی انتہا اکبر اعظم کا دور ہے جب دین محمدیؐ کو ایک ہزار سال تک محدود کرتے ہوئے اسے ختم کر کے دین اکبری رائج کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس دورِ زوال کے بعد اسلام کی سربلندی کا سفر شروع ہو گیا۔

چنانچہ گزشتہ چار سو برس کے دوران تاریخ انسانی کدھر جا رہی ہے اس کا شعور ضروری ہے۔ بقول اقبال ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بُو
زانکہ از خاکش بروید آرزو
یا زنورِ مصطفیٰ ؐ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ؐ است

گویا نوع انسانی کا قافلہ "تلاشِ مصطفیٰ ؐ" میں محو جستجو ہے۔ اب مصطفیٰ ﷺ کو Realize' Recover اور Regain کرنا ہے' انہیں دوبارہ حاصل کرنا ہے۔ گزشتہ ایک ہزار برس میں انسانیت نے حضور ﷺ کو کھو دیا تھا اور اب وہ انہیں تلاش کر رہی ہے۔ گویا یہ دور در حقیقت "تلاش مصطفیٰ ؐ" کا دور ہے۔

اِس دنیا میں تلاش مصطفیٰ ؐ کا عمل تین سطحوں پر جاری و ساری ہے۔ ایک سطح پر پوری نوع انسانی چاروناچار' خواہی نخواہی اور شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی نظام عدل وقسط کی تلاش میں سرگرداں ہے جو محمد مصطفیٰ ﷺ نے عطا کیا تھا۔ نوع انسانی افراط و تفریط کے دھکے کھا رہی ہے لیکن بالآخر قافلۂ انسانیت دین اسلام کے عادلانہ نظام کی طرف ہی جا رہا ہے۔ بقول اقبال ؎

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر ؐ کہیں

ابلیس کو سخت اندیشہ لاحق ہے کہ انسانیت کا قافلہ تو شرع محمدیؐ کی طرف جا رہا ہے۔ کمیونزم کی موت کے بعد انسان کہاں کھڑا ہے؟ امریکہ کے بہت بڑے دانشور "فرانسس فوکویاما" نے اپنی کتاب End of History میں کہا ہے کہ انسانیت کے ارتقاء کا نقطۂ عروج ہمارا نظام ہی ہے جو سیکولر سرمایہ دارانہ جمہوریت پر مبنی ہے جس سے بہتر نظام موجود نہیں ہے۔ لیکن ایک دوسرے امریکی دانشور سیموئیل ہنٹنگٹن نے یہ خیال رد کر دیا اور کہا کہ Clash of Civilizations ابھی ہونا باقی ہے۔

بعثت محمدیؐ کی جانب انسانیت کے سفر کی دوسری سطح قومی اور ملی ہے۔ امتِ مسلمہ

نے نو آبادیاتی نظام کے تسلط سے آزادی حاصل کی اور اب اپنے لئے ایک نئے نظام کی تلاش میں ہے۔ گویا امت مسلمہ کا رخ بھی قومی و ملی سطح پر ہی سہی' تلاش مصطفیٰ ہی کی طرف ہے۔ خاص طور پر پاکستان کا معاملہ تو "کافرنتوانی شد ناچار مسلمان شو" کا سا ہے۔ ہمارے لئے تو اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار ہی نہیں ہے۔ پاکستان کی بقاء کا واحد سہارا صرف اور صرف اسلام ہے' اس طرف اگر پیش قدمی نہ کی گئی تو ہمارا ملی تشخص ختم ہو جائے گا۔

اسلام کی جانب اس سفر کی تیسری سطح پر احیائی تحریکیں کام کر رہی ہیں۔ انڈونیشیا میں مسجومی پارٹی' ہندوستان میں علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک' مولانا مودودی کی جماعت اسلامی' ایران میں فدائین کی جماعت اور مصر میں "الاخوان المسلمون" یہ سب جماعتیں اور تحریکیں دین کو از سرنو ایک نظام زندگی کی حیثیت سے غالب و نافذ کرنے کے لئے میدان میں آئیں۔ احیائی تحریکوں کی تمام تر مساعی "مجدد کامل" کی تلاش سے عبارت ہے جو دین کو اسی طریقے پر قائم کر دے گا جس طریقے سے محمد عربی ﷺ نے اسے غالب کیا تھا۔ لیکن ان تحریکوں کے ضمن میں یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ سورج جب غروب ہو جاتا ہے تو آسمان پر سرخی باقی رہ جاتی ہے۔ بعثت محمدیؐ کے پہلے ہزار سال کے اختتام پر دین محمدی ﷺ جب اپنے انتہائی زوال کو پہنچ گیا اور "مسلمانی در کتاب و مسلمانان در گور" والا معاملہ ہو گیا تو اب دوبارہ اس کے احیاء کا مرحلہ شروع ہوا۔ لیکن اب غلبۂ دین کا کام درجہ بدرجہ پایۂ تکمیل کو پہنچے گا جیسے چاند درجہ بدرجہ مکمل ہوتا ہے۔ اب وہ کام ایک ہی جست میں نہیں ہو سکتا جو نبی اکرم ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے تکمیل پذیر ہوا تھا کہ کل بیس برس میں مکمل انقلاب برپا ہو گیا۔ اب کوششیں ہوں گی' تحریکیں اٹھیں گی' قوتیں اور مالی وسائل صرف ہوں گے' لیکن اس جدوجہد میں ایک ایک سیڑھی اوپر چڑھنے کا معاملہ ہو گا' چنانچہ احیائی تحریکوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔

یہ تمام احیائی تحریکیں اگرچہ اپنے اپنے ممالک میں اسلامی انقلاب لانے میں تو کامیاب نہ ہو سکیں لیکن ان کے باوجود ان تحریکوں کے اثرات تو بہرحال موجود ہیں۔ برعظیم کی احیائی تحریک میں علامہ اقبال کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ علامہ اقبال دو

حیثیتوں کے ساتھ میدان میں نکلے۔ قومی و ملی سطح پر بھی ان کا بہت اونچا مقام ہے۔ وہ مسلم لیگ کی تحریک کے روح رواں بھی تھے، جس نے برعظیم کے مسلمانوں کی آزادی کے لئے تحریک پاکستان کی قیادت کی، نیز وہ پاکستان کا خواب دیکھنے والے، اس کے مفکر، مصور اور مبشر بھی تھے۔ قائداعظم کو انگلستان سے بلانے والے بھی علامہ ہی تھے۔ فکری سطح پر علامہ اقبال نے دین کے اصل تصورات کو از سرنو تازہ کیا وگرنہ دین تو یہاں مذہب بن کر اور عقائد، عبادات اور رسومات تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ یوں دین کے غلبہ و احیاء کے لئے یکے بعد دیگرے کئی کوششیں ہوئیں، جو اقبال کی مرہون منت ہیں۔ لیکن یہ جدوجہد لازماً ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ﴾ کے مصداق درجہ بدرجہ ہی کامیابی کی منزل تک رسائی حاصل کر سکتی ہے۔ یہ تو حضورؐ کی ذات تھی جنہوں نے بیس سال کے عرصے میں انقلاب کے تمام مراحل طے کر لئے۔ اسی حوالے سے حضورؐ کو "امتناع نظیر" کی حیثیت حاصل ہے، یعنی ایسی شخصیت جس کی کوئی دوسری مثال پیش کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔

مختلف احیائی کڑیوں میں تنظیم اسلامی کو تیسری کڑی کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کی حزب اللہ کے بعد جماعت اسلامی اور اب تنظیم اسلامی وہی کام کر رہی ہے۔ تنظیم اسلامی کے پیش نظر بھی یہی ہے کہ ایسے لوگوں کی جماعت تیار کی جائے جو پہلے اپنے وجود پر اور اپنے گھر میں دین قائم کر چکے ہوں۔ پھر ایک شخص کے ہاتھ پر بیعت کر کے باطل سے پنجہ آزمائی کے لئے میدان میں آ جائیں۔ لیکن اس دوران میں ہم "اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ" کے حوالے سے حکمرانوں کو مشورے بھی دیتے رہیں گے۔ ہم اربابِ اختیار میں سے نہ کسی کے حریف ہیں نہ حلیف، بلکہ ہماری اصل دلچسپی اسلام کے عادلانہ نظام کے نفاذ سے ہے۔ اسی لئے ہم حکمرانوں کو نفاذِ اسلام کے ضمن میں پیش رفت کے مشورے دیتے ہیں کہ وہ قرارداد مقاصد کو دستور کا حصہ بنانے کے بعد مزید پیش رفت کرتے ہوئے اس سے متصادم آئینی دفعات کو کالعدم قرار دے کر قرآن و سنت کی بالادستی قائم کریں، تاکہ قومی و ملی سطح پر بھی نفاذ اسلام کے حوالے سے ہمارے قدم آگے بڑھ سکیں۔

اس حوالے سے ہم ماضی میں بھی کوششیں کرتے رہے ہیں، اب بھی کر رہے ہیں

اور آئندہ بھی کرتے رہیں گے۔ میں نے ۱۳/ جولائی کو میاں نواز شریف سے جو ملاقات کی تھی اس موقع کے لئے میں اپنا نقطۂ نظر تحریر کر کے لے گیا تھا۔ یہ طویل خط میں نے میاں نواز شریف کو خود پڑھ کر سنایا اور انہیں بتایا کہ انسانی تاریخ کا دھارا کس رخ پر جا رہا ہے۔ دین حق کا غلبہ تو ہو کر رہے گا' دنیا چار و ناچار اُدھر ہی جا رہی ہے۔ اب یہ ہر شخص کا انفرادی فیصلہ ہے کہ وہ کسے ترجیح دیتا ہے اور کسے مؤخر کر دیتا ہے' کون اسلام کے عالمی غلبہ کی پیش رفت میں اپنا حصہ ڈالتا ہے اور کون اپنے آپ کو اس سے محروم رکھ کر بدنصیب بنتا ہے۔ میاں نواز شریف سے میں نے کہا کہ آپ آگے آئیں اور ایٹمی دھماکوں کے بعد اگلا قدم اٹھائیں اور "دینی دھماکہ" بھی کر ڈالیں۔ تاریخ نے اس سے پہلے اس ملک میں ذوالفقار علی بھٹو کو موقع دیا تھا کہ وہ جاگیرداری نظام ختم کر کے اس ملک کا ماؤزے تنگ بن سکتا تھا' لیکن وہ اپنی جاگیرداری کی کھال سے باہر نہ نکل سکا لہٰذا ناکام و بدنصیب رہا۔ اسی طرح ضیاء الحق کو ملکی تاریخ میں یہ موقع حاصل ہوا تھا کہ وہ عمر بن عبدالعزیزؒ کا مقام حاصل کر سکتا تھا۔ نظام مصطفیٰؐ کی تحریک کا جوش و خروش تحریک پاکستان سے بھی زیادہ تھا' لیکن وہ ان حالات میں بھی بدنصیب اور محروم ہی رہا۔ بالکل اسی طرح اب میاں نواز شریف کو موقع حاصل ہوا ہے' لیکن اس کی کچھ شرائط اور تقاضے ہیں۔ ایٹمی دھماکوں کے بعد ملکی تاریخ میں یہ سنہری موقع نواز شریف کے ہاتھ میں آیا ہے کہ وہ تاریخ ساز کردار ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے انہیں ذاتی طور پر قربانی و ایثار کی عظیم مثالیں قائم کرنا ہوں گی اور سرمایہ داری کے خول سے باہر نکلنا ہو گا۔ میں نے میاں نواز شریف کو یہ مشورہ دیا ہے کہ رائے ونڈ کے محلات اور اراضی کو قومی خود انحصاری فنڈ میں جمع کروا کر ماڈل ٹاؤن والی کوٹھیوں پر قناعت کریں اور اپنے کارخانوں میں سے صرف ان کو اپنے پاس رکھیں جن کے بارے میں یقین ہو کہ ان کے ذمے کوئی رقم واجب الادا نہیں' بقیہ کارخانوں کو ملک و قوم کے حوالے کریں۔ قوم سے قربانی کے مطالبہ کو منوانے سے پہلے میاں نواز شریف کو خود اپنے تمام معاملات کو روز روشن کی طرح صاف و شفاف بنانا ہو گا۔ احتساب سیل کے چیئرمین سینیٹر سیف الرحمٰن کی غیر جانبدارانہ حیثیت مجروح ہو چکی ہے اور اگر حالیہ دنوں میں ان پر لگایا گیا لگژری گاڑیوں کی درآمد کے

(باقی صفحہ ۱۶ پر)

ڈاکٹر اسرار احمد

وَمَالِیَ

نحمدہٗ ونصلّی علیٰ رسولہ الکریم

اعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

﴿ وَمَالِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ءَ اَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ ۝ اِنِّيْٓ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ ﴾ (یٰسین : ۲۲ تا ۲۴)

قرآن مجید کا ۲۳واں پارہ "وَمَالِیَ" کے نام سے موسوم ہے اور اس میں اولاً اکثر حصہ سورۂ یٰسین کا شامل ہے یعنی باسٹھ آیات۔ پھر سورۃ الصافات اور سورۂ ص مکمل شامل ہے اور آخر میں سورۃ الزمر کی اکتیس آیات۔

سورۂ یٰسین کو نبی اکرم ﷺ نے قرآن حکیم کا دل قرار دیا ہے۔ اس کی قطعی اور حتمی بنیاد تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ ہی کے علم میں ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس سورۂ مبارکہ کو پڑھتے ہوئے اس کے "ردھم" میں ایک خاص کیفیت کا احساس ہوتا ہے جو ایک دھڑکتے ہوئے دل سے بہت مشابہ ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں توحید' معاد اور رسالت کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ دو اہم سائنسی حقائق کی طرف بھی توجہ دلائی گئی ہے۔ مثلاً ایک علم فلکیات سے متعلق کہ سورج اور چاند کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ﴿ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ﴾ (یٰسین : ۴۰) یعنی یہ تمام اجرام سماویہ اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں اور ان کی گردش کسی تیرنے والے سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ اسی طرح علم حیاتیات کی ایک اہم حقیقت بیان فرمادی ہے کہ ﴿ وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ﴾ (یٰسین : ۶۸) ایک خاص عمر کے بعد جب عمر میں اضافہ ہوتا ہے تو جسم میں تخریبی عمل بڑھتا جاتا ہے اور تعمیری عمل کم ہوتا چلا جاتا ہے' یہاں تک کہ ایک وقت وہ بھی آتا ہے ﴿ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ﴾ (النحل :۷۰) کہ بڑے بڑے ذہین و فطین لوگ بھی عمر کی ایک حد پر آکر گویا اپنے اس تمام علم اور ذہانت و متانت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

سورۃ الصافات اور سورۂ ص' ان دونوں میں سورۂ مریم اور سورۃ الانبیاء کے مانند انبیائے کرام کا ذکر ہے' اور یہ ذکر یہاں بھی حضرات انبیاء کرام کی شخصی عظمتوں اور ان کے کردار کی رفعتوں کے اعتبار سے آیا ہے۔ چنانچہ سورۃ الصافات میں حضرت نوح علیہ السلام کے ذکر کے بعد تفصیل کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس حجت کا ذکر ہوا جو انہوں نے اپنی قوم پر ان کی بُت پرستی کے خلاف قائم کی۔ یہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت جس قوم میں ہوئی' اس میں تین قسم کے شرک موجود تھے۔ ستارہ پرستی بھی تھی' بُت پرستی بھی تھی اور شہ پرستی بھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم کو توحید کی دعوت دی اور پرستش کی ان تینوں اقسام پر بڑی کاری ضرب لگائی۔ ستارہ پرستی پر انہوں نے جو ضرب لگائی اس کا بیان سورۃ الانعام میں ہے۔ شاہ پرستی پر جو ضرب لگائی اس کا بیان سورۃ البقرہ میں ہے' اور ان کی بُت پرستی پر جو کاری وار حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا اس کا ذکر سورۃ الانبیاء کے علاوہ سورۃ الصافات میں بھی ہے کہ ایک بڑی پوجا کے موقع پر جبکہ شہر کی تقریباً تمام آبادی کہیں باہر چلی گئی تھی' حضرت ابراہیم علیہ السلام کسی عذر کی وجہ سے شہر ہی میں مقیم رہے۔ بعد میں موقع پا کر آپؑ ان کے بڑے بُت خانے میں گھس گئے اور تمام بتوں کو توڑ پھوڑ ڈالا' سوائے سب سے بڑے بُت کے۔ اور وہ تیشہ کہ جس سے آپؑ نے تمام بتوں کو توڑا تھا اُس بڑے بُت کی گردن میں حمائل کر دیا۔ جب لوگ واپس آئے تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ لوگوں نے اس بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پُرسش کی تو آپؑ نے فرمایا کہ اس بڑے سے پوچھو جس کی گردن میں یہ تیشہ بھی لٹکا ہوا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس کا جواب صرف ایک ہی ہو سکتا تھا کہ تم جانتے ہو کہ یہ نہ تو بول سکتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔ اب یہ موقع تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کہ انہوں نے فرمایا "تُف ہے تم پر کہ تم ان کو پوجتے ہو جو نہ اپنی مدافعت کر سکیں' نہ سن سکیں' نہ بولی سکیں"۔ قوم کے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ ایک مرتبہ تو خاموش ہو گئی' لیکن پھر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر تشدد کرنے پر آمادہ ہو گئی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کے آخری دَور کا وہ واقعہ بھی اس سورۂ مبارکہ میں نقل ہوا ہے جو ان کے امتحانات میں سے سب سے کڑا اور سب سے آخری امتحان تھا۔ لگ بھگ ستاسی برس کی عمر میں اللہ سے دعائیں کر کر کے حضرت اسماعیل علیہ السلام جیسا بیٹا حاصل ہوا' لیکن جب وہ بیٹا تیرہ برس کا ہوا اور باپ کے ساتھ بھاگ دوڑ کے قابل ہوا تو اللہ کا حکم ہوا کہ اس

بیٹے کو ہمارے نام پر ذبح کردو۔ چنانچہ یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا بھی نقل ہوئی : ﴿ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ﴾ (الصافات : ۱۰۰) "پروردگار، مجھے ایک بیٹا عطا کر جو صالحوں میں سے ہو" ـــــ ﴿ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ ﴾ (آیت ۱۰۱) "پس ہم نے انہیں ایک صاحبِ حلم بیٹے کی بشارت دی" ﴿ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ﴾ (آیت ۱۰۲) "پھر جب وہ ان کے ساتھ بھاگ دوڑ کے قابل ہوا تو انہوں نے کہا کہ اے میرے بچے، میں تو خواب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں، اب سوچو کہ تمہاری رائے کیا ہے؟" اس سعادت مند بیٹے کا جواب تھا : ﴿ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ﴾ (آیت ۱۰۲) "ابا جان کر گزریے جس کا حکم آپ کو ہوا ہے، آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے"۔ ﴿ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ ﴾ (آیات ۱۰۳ تا ۱۰۶) "اور جب باپ بیٹا دونوں اللہ کے حکم کی تعمیل پر آمادہ ہو گئے اور ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کو پیشانی کے بل گرا دیا تو اُس وقت ہم نے ندا دی : اے ابراہیم! تم نے اپنے خواب کو سچا کر دیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک بہت بڑا امتحان ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ جس کا امتحان لیا جا رہا ہو اس کی کامیابی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ خود ممتحن یہ کہے کہ یہ امتحان واقعی بڑا کڑا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام زندگی بھر جن امتحانات سے دوچار رہے اور جن سے کامیابی سے گزرتے رہے ان میں سے یہ آخری امتحان واقعتاً بڑا سخت تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے انہیں کامیاب قرار دیا۔

سورۂ ص کا آغاز ﴿ صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ ۝ ﴾ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ "قسم ہے قرآن کی جو ذکر و موعظت اور نصیحت کا حامل ہے"۔ اس لئے کہ یہ قرآن مجید کی خود اپنی حقانیت اور صداقت پر بھی سب سے بڑی دلیل ہے اور نبی اکرم ﷺ کی بھی سب سے بڑی برہان ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے آخر میں وہ مضمون دوبارہ آیا جو اس سے پہلے چودھویں پارہ میں سورۃ الحجر میں آ چکا ہے ـــــ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی عظمت کی اصل بنیاد یہ ہے کہ ان کے خاکی جسد میں روح ربانی پھونکی گئی : ﴿ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝ ﴾ (ص : ۷۲)

آخر میں سورۃ الزمر کا آغاز ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ قرآن مجید کی

نہایت عظیم سورتوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے اور یہ بڑی جامع تمہید ہے اُن سات سورتوں کے لئے جو اس کے بعد آتی ہیں اور جن کا آغاز ہوتا ہے "حٰمٓ" کے حروف مقطعات سے۔ اس سورۂ مبارکہ کا مرکزی مضمون خدائے واحد کی اطاعت ہے 'یعنی اطاعت کامل' ایسی اطاعت کہ جس میں کسی طرح کا کوئی کھوٹ شامل نہ ہو۔ چنانچہ اس کا آغاز ہی ان الفاظ سے ہوتا ہے : ﴿ اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ﴾ (الزمر : ۲) "اے نبیؐ ہم نے یہ کتاب (قرآن مجید) آپ پر حق کے ساتھ نازل فرمائی ہے 'پس بندگی' پرستش اور اطاعت کرو اللہ کی' اپنی کُل اطاعت کو صرف اس کے لئے خالص کرتے ہوئے"۔ آگے فرمایا : ﴿ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ﴾ (آیت ۳) "آگاہ ہو جاؤ اطاعت تو کُل کی کُل اور خالصتاً اللہ کے لئے ہے"۔ مزید فرمایا : ﴿ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ ﴾ (آیت ۱۱) "اے نبیؐ اعلان کر دیجئے مجھے تو اپنے رب کی طرف سے اس کا حکم ملا ہے کہ میں اس کی بندگی اور پرستش کروں اور اطاعت کروں کل کی کل اطاعت کو اسی کے لئے خالص کرتے ہوئے"۔ اس لئے کہ یہی درحقیقت دین اسلام کا اصل تقاضا ہے' یہی درحقیقت عبادت کا اصل تقاضا ہے' یہی وہ توحیدی عمل ہے کہ جس کی دعوت کے لئے تمام انبیاء کرام تشریف لاتے رہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین

بقیہ : حکم وعبر

سیکنڈل کا الزام درست ہے تو پھر یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ ان کا کردار "چور بنے ہیں چوکیدار" کا مظہر بن چکا ہے۔ ضروری ہے کہ میاں نواز شریف کے قریبی ساتھیوں کا طرزِ عمل بھی پوری طرح شفاف ہو۔ وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

(مرتب : نعیم اختر عدنان)

علّامہ اقبال کے افکار و خیالات (۲)

ڈاکٹر اسرار احمد

نشأۃ ثانیہ کی جدوجہد میں اقبال کا مقام

برعظیم پاک و ہند میں مجددین کا سلسلہ ایک "سلسلۃ الذھب" (سنہری زنجیر) تھا جو شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ دہلوی، سید احمد بریلوی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہم اللہ تک پہنچا۔ اس سے آگے جو ایک سلسلہ شروع ہوتا ہے اس کی اہم ترین شخصیت علامہ اقبال ہیں۔ اس ضمن میں ان کا سب سے بڑا حصہ (contribution) فکر اسلامی کی تجدید ہے۔ یعنی جدید علم کلام، جدید سائنس، جدید ریاضی اور جدید سائیکالوجی کی بنیاد پر ایمان باللہ اور یقین کی کیفیت کو دوبارہ پیدا کرنے کی کوشش۔ کیونکہ اس دور میں امام رازی یا کسی اور کا علم کلام کام نہیں دے سکتا۔ اُس میں یونانی فلسفہ اور یونانی منطق کا جواب تھا۔ اب یونان کا فلسفہ مرچکا، یونان کی منطق دفن ہو چکی، اب تو جدید سائنس کا دور ہے۔ اس سائنس کے حوالہ سے نئی سوچ آئی ہے، نیا فکر آیا ہے۔ نئی نئی جہتیں (dimensions) متعارف ہوئی ہیں، انسان کا زاویۂ نگاہ بدل گیا ہے۔ اس اعتبار سے دین کے بنیادی حقائق کو مبرہن کرنا، ان کو مؤکد اور مدلل کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کام کا آغاز علامہ اقبال نے کیا۔ اپنی اس تحریری کاوش کا نام انہوں نے Reconstructions of Religious Thought in Islam رکھا، جس کا ترجمہ سید نذیر نیازی مرحوم نے "الٰہیاتِ اسلامیہ کی تشکیل نو" کے نام سے کیا۔

اقبال کا دوسرا سب سے بڑا کارنامہ دین اور دنیا میں پیدا ہونے والی دوئی کو مٹانا اور دین و سیاست کو باہم جوڑنا ہے۔ آج پوری دنیا سیکولرزم کی گرویدہ ہو چکی ہے۔ مگر یہ اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ خلافت راشدہ کے دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ جو مسلمانوں کا خلیفہ یا امیر ہے وہی اُن کا سپہ سالار ہے، وہی ان کا روحانی، علمی اور مذہبی راہنما ہے۔

اس کے بعد کیا ہوا؟ حکومت علیحدہ اور دین علیحدہ ہو گیا۔ سلاطین و ملوک یعنی اصحابِ سیف ایک طرف اور اصحابِ قلم و قرطاس دوسری طرف۔ یہ علماء' محدثین' مفسرین اور فقہاء رجال دین ہیں۔ آگے چل کر رجال دین بھی دو قسم کے ہو گئے۔ ایک علوم ظاہر یا معقولات کے پڑھنے والے اور دوسرے علوم باطن رکھنے والے یعنی صلحا و صوفیاء۔ اس طرح امت کی قیادت کی توحید تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ بقول اقبال ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

اقبال نے یہ شعر پہلی جنگ عظیم کے بعد دنیا کی بدلتی ہوئی صورتحال کے بارے میں کہا تھا کہ تثلیث کے فرزند یعنی انگریز اور یورپین' جو کرسچین تھے' میراث خلیل یعنی پورا مڈل ایسٹ' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی قائم کردہ حکومت کے حصے بخرے کر کے' لے گئے۔ لیکن میں اسے اس مفہوم میں استعمال کر رہا ہوں کہ توحید قیادت تقسیم ہو کر تثلیث قیادت ہو گئی۔ عبداللہ بن مبارک تبع تابعین میں سے معروف فقیہ ہیں' انہوں نے اس زوال پر مرثیہ کہا ہے' اُن کا ایک شعر ہے :

مَا اَفْسَدَ الدِّینَ اِلاَّ الْمُلُوکُ
وَاَحْبَارُ سَوءٍ وَرُھْبَانُھا

دین میں جتنا بھی فساد پیدا کیا ہے وہ تین طبقوں نے کیا ہے۔ بادشاہ' علماء سوء یعنی وہ عالم جو علم کو دولت کمانے کا ذریعہ بناتے ہیں اور وہ راہب (صوفی) جو تصوف کے پردے میں دنیا داری کرتے ہیں۔ اسی کو اقبال نے اس طرح کہا ؎

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کُشتہ ، مُلاّئی و سلطانی و پیری

یہاں بھی وہی تین گروپ ہیں جنہوں نے دین کے تصورات کو بُری طرح متاثر کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ ؎

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ' ہوس کی وزیری

نیز ؎

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

حقیقت یہ ہے کہ دین اسلام ایک کلی وحدت ہے' اس کا مکمل نظام ہے۔ یہ دین اپنا غلبہ چاہتا ہے اور یہ کسی اور نظام کے تابع ہو کر نہیں رہتا' ورنہ وہ مذہب بن جاتا ہے۔ بقول اقبال ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت

ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ہمارے یہاں تینوں مذہبی طبقات کے اندر بہت اونچی شخصیات ایسی پیدا ہوئیں جنہوں نے مسلمانوں کو یہ درس دیا ـــــ ایک دیوبندیوں میں' ایک بریلویوں میں اور ایک اہل حدیث میں ـــــ یہ سبق کہ ہندوستان میں انگریزوں کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کرو' انگریز کی مخالفت مت کرو' اس نے ہمیں مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ میں محولہ بالا تینوں شخصیات میں سے کسی کا نام نہیں لیتا' نہ یہ سمجھا جائے کہ کسی ایک طبقے کی بات ہو رہی ہے اور نہ ہی میں ان کی بات کو بدنیتی پر محمول کرتا ہوں (معاذ اللہ)۔ میں سمجھتا ہوں اُن کی نیت کی حد تک معاملہ حقیقت پسندانہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ حالات اتنے بدل گئے ہیں کہ انگریز یہاں سے چلا گیا تو ہندو ہماری تکہ بوٹی کر دے گا' اب ہمارے اندر دم خم نہیں ہے۔ لہٰذا وہ سمجھتے تھے کہ بہت غنیمت ہے کہ اگر انگریز یہاں رہے۔ ممکن ہے یہ انگریز ہی کی پڑھائی ہوئی پٹی ہو۔ "Divide and rule" اس کا اصول تھا اور وہ بہرحال ہندوستان پر قابض رہنا چاہتا تھا۔ ہندوستان سونے کی چڑیا تھی' یہاں سے اسے بہت کچھ ملتا تھا۔ یہ تو دوسری جنگ عظیم کے بعد انگریز کو یہاں سے بھاگنا پڑا۔ اُس وقت حالات بدل گئے' عالمی صورت حال تبدیل ہو گئی' مغرب سے امریکہ نمایاں ہو گیا' ورنہ یہ سونے کی چڑیا چھوڑنے کے لئے کوئی آسانی سے تیار ہو سکتا تھا؟ بہرحال یہاں ایک طبقہ انگریزوں کا وفادار ہو چکا تھا' اگرچہ ان کی سوچ بھی کوئی بدنیتی پر مبنی نہ تھی' مگر اقبال کی سوچ نہایت اَرفع تھی کہ اسلام دین ہے اور یہ متحدہ قومیت کے اندر گم اور ضم ہو جائے تو اس کی حیثیت ختم ہو جائے گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں اقبال کو شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کا "بروز" کہتا

ہوں۔ "بَرَزَ" کسی چیز کے ظاہر ہونے کو کہتے ہیں۔ وہی فتنہ 'جو سترھویں صدی میں اٹھا تھا' اب بیسویں صدی میں سر اٹھا چکا تھا۔ اب یہ بہت بڑے سیاسی مہاتما کے ذریعے سے اٹھا تھا جس کا نام مہاتما گاندھی ہے۔ اُس کا فلسفہ تھا کہ مذہب تو ہر کسی کا انفرادی معاملہ ہے' کیا فرق پڑتا ہے کہ کوئی مسجد میں چلا جائے یا کوئی مندر میں چلا جائے۔ کسی نے لٹیا لے لی جو ٹونٹی کے بغیر ہے اور کسی نے لوٹا پکڑ لیا جو ٹونٹی والا ہے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ کسی نے ٹخنوں سے اوپر پاجامہ پہن لیا اور کسی نے دھوتی لے لی' اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ سب دین سچے ہیں' سب اچھے ہیں' سب کو جمع کرو' گھول کر ان کا ملغوبہ بناؤ اور ایک قوم بنالو۔ ہندو' مسلمان' سکھ' پارسی اور عیسائی' کسے باشد' جو ہندوستان میں رہتا ہے وہ ایک متحدہ ہندی قومیت میں گم ہو جائے۔

یہ فلسفہ کیوں اٹھایا گیا؟ سمجھ لیجئے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہوا' اکبر نے سمجھا تھا کہ ہندوستان کی عظمت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہبی اختلافات ہیں' یہ ختم ہو جائیں تو ہندوستان مضبوط و مستحکم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح گاندھی کا خیال تھا کہ یہاں ہندوستان میں انگریز سے نجات حاصل کرنے کے لئے مربوط اور متحدہ جدوجہد لازمی ہے۔ اگر ہندوستان کی اقوام' مسلمان اور ہندو علیحدہ علیحدہ رہیں تو انگریز کیسے جائے گا؟ انگریز تو شطرنج لے کر بیٹھے گا' اُس کے مہروں کو اِدھر اُدھر کر کے اپنی چال سیدھی کرے گا' مہروں کو استعمال کر کے کھیل کھیلتا رہے گا۔ گویا بالکل وہی صورتحال پیدا ہو چکی تھی جو دین اکبری کے وقت تھی۔ بدقسمتی سے اکبر کو دو بہت بڑے علماء پٹی پڑھانے والے مل گئے تھے اور یہاں بھی ایک بہت بڑا عالم گاندھی جی کے فتراک کا نخچیر بن گیا۔ یعنی مولانا ابوالکلام آزاد متحدہ قومیت کا علمبردار بن کر اٹھا۔ وہ اتنی عظیم شخصیت کا مالک تھا کہ اس کے مقابلے کا کوئی شخص ہندوستان میں موجود نہ تھا۔ ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے "الہلال" اور "البلاغ" والا ابوالکلام انتہائی بلندی پر پہنچ چکا تھا۔ پھر اُس کی خطابت' اس کی ادبیت' اُس کی فصاحت و بلاغت کا کوئی جواب نہ تھا۔ ہندوستان میں اسلام کے لئے یہ انتہائی خطرناک صورتحال پیدا ہو رہی تھی۔ اس فتنے کے سامنے سینہ سپر ہوا ہے تو اقبال۔ علامہ اقبال نے اپنی نسبت شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جوڑی ہے' مگر اشارتاً

یہ کہہ کر کہ ؎

لا پھر اِک بار وہی بادہ و جام اے ساقی!
ہاتھ آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی!
تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی!

شیخ احمد سرہندیؒ کو تین سو سال ہو گئے تھے کہ انہوں نے اُس وقت ملت اسلامیہ کا تشخص محکم کیا تھا۔ اقبال کہتے ہیں ؎

حاضر ہوا میں شیخِ مجدّد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اِس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اِس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار!

ہند میں سرمایۂ ملت ختم ہو رہا تھا۔ ہمہ اُوستی تصوف چھا رہا تھا۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ لاہور میں مادھولال حسین کا میلہ لگتا ہے۔ یہ "مادھولال حسین" کس بلا کا نام ہے؟ یہ مذاہب کا ملغوبہ تھا۔ اس طرح کے ملغوبے بننے شروع ہو گئے تھے۔ بھگتی تحریک کے نام پر ہندوازم اور اسلام کا ملغوبہ بن رہا تھا۔ سکھ مذہب کو بھی اسی بھگتی تحریک نے جنم دیا تھا۔ توحید اسلام سے لی' باقی سب کچھ ہندوازم سے لیا۔ انہیں پتہ تھا کہ توحید کا راستہ اب یہاں کوئی نہیں روک سکتا اور اگر ہندوستان میں ذات پات کی تقسیم رہتی ہے تو اسلام کا راستہ نہیں روکا جا سکتا۔ چنانچہ بھگتی تحریک میں سب اکٹھے ہو گئے' چاہے گرونانک ہو یا بھگت کبیر ہو۔ یہ درحقیقت دفاع تھا (Indian defence against Islam) کہ اسلام کی کچھ ایسی چیزیں جو اس کی اصل قوت تسخیر ہیں ہم لے لیں تاکہ اپنے دفاع کے

لئے ہم انہی کے ہتھیار انہی کے خلاف استعمال کر سکیں۔ یہ تو بعد میں باہم تصادم ہوا ہے تو یہاں سکھوں نے ایک militant unit کی صورت اختیار کر لی ورنہ یہ بھی بھگتی تحریک ہی تھی۔ گرو گرنتھ پڑھئے' اس میں قرآن کا ذکر ہے' حضور ﷺ کا ذکر ہے' بابا فرید کے اشعار ہیں' یہ سب کچھ ہے۔ امرتسر میں گولڈن ٹمپل کا سنگ بنیاد بھلا کس نے رکھا تھا؟ یہ حضرت میاں میر قادریؒ تھے جنہیں اس کے لئے خاص طور پر لاہور سے لے جایا گیا تھا۔ تو یہ وہ دور تھا کہ ملت کا تشخص ختم ہو رہا تھا۔ اس صدی میں آ کر پھر وہی خطرہ ظاہر ہوا کہ ملت اسلامیہ کا تشخص ناپید ہو رہا تھا۔ اس فتنہ کے آگے جو شخص چٹان کی طرح کھڑا ہوا وہ اقبال ہے۔ کسی اور کی حیثیت نہ تھی کہ ابوالکلام آزاد کے سامنے کھڑا ہوتا یا مولانا حسین احمد مدنیؒ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مدنیؒ کو بھی ایک مرتبہ دفاعی پوزیشن پر آجانا پڑا۔

شیخ الہندؒ کی سوچ مولانا مدنیؒ سے مختلف تھی۔ میری ایک کتاب ہے "جماعت شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی"۔ میں اپنا رشتہ شیخ الہند سے جوڑتا ہوں' الحمدللہ ـــــ لیکن میرے نزدیک مولانا مدنیؒ کا موقف صحیح نہیں تھا اگرچہ وہ نیک نیتی پر مبنی تھا۔ وہ بھی یہ سمجھ چکے تھے کہ اگر ہم مل جل کر کوشش نہ کریں گے تو انگریز کو کیسے نکالیں گے۔ نتیجتاً وہ انگریز دشمنی میں ہندو کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ مگر ان کی نظر ہندو کے عزائم پر نہ تھی۔ ہندو کی امنگیں پروان چڑھ رہی تھیں اور وہ اپنی ہزار سالہ شکست کا بدلہ چکانا چاہتا تھا۔ یہ سب چیزیں مولانا مدنیؒ کی نظر سے اوجھل رہیں کیونکہ انگریز سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ انتہا کو پہنچ چکا تھا اور اس کے مقابلے میں دوسری چیزیں ذہن میں نہیں رہی تھیں۔ یہ بات پھر تازہ کر لیجئے کہ ان کی یہ سوچ ہرگز بدنیتی پر مبنی نہ تھی (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)۔ جو انہیں بدنیت سمجھے خود اُس کے ایمان میں شک ہے۔ یہاں ایک عام اصول بھی مدنظر رہے کہ کسی کے ساتھ اختلاف کرتے وقت مخالف کے نقطۂ نظر کو پوری ہمدردی کے ساتھ سمجھنا چاہئے۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں' ان حقائق پر مبنی میری ایک تالیف "اسلام اور پاکستان" کے پہلے باب میں میں نے ان سب چیزوں پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہاں مجھے یہ کہنا ہے کہ سولہویں صدی عیسوی میں جو کام شیخ احمد سرہندیؒ نے کیا' جو کہ گیارھویں

صدی ہجری کے بہت بڑے مجدد تھے' وہ کام اس صدی میں اللہ تعالیٰ نے اُس مردِ قلندر سے لیا جس کا نام اقبال ہے۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ نے دہلی کی ایک مسجد میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ آج کل کے زمانے میں قومیں وطن سے بنتی ہیں۔ مولانا مدنیؒ کی بات اس اعتبار سے درست تھی کہ اس بیسویں صدی کے زمانے میں دو اصول کار فرما ہیں' وطنیت اور لادینیت۔ دونوں مل کر ایک وحدت بنتے ہیں۔ لادینیت (Secularism) کیا ہے؟ یہ کہ ملک کا' ریاست کا' قانون کا' سیاست کا' نظام کا تعلق کسی مذہب سے نہیں۔ اور وطنیت (Nationalism) کیا ہے؟ یہ کہ ایک ملک میں رہنے والے تمام لوگ ایک قوم ہیں۔ اس قوم میں ہندو' مسلمان' سکھ' پارسی اور عیسائی سبھی شامل ہیں۔ اگر حکومت کا تعلق مذہب سے ہو گا تو جھگڑا پیدا ہو گا۔ لہٰذا متحدہ وطنی قومیت کی صورت میں اس کا تعلق مذہب سے نہ ہو گا۔ یہ دونوں چیزیں آپس میں چارپائی کی چول کی طرح فٹ بیٹھتی ہیں۔ اقبال نے ان دونوں پر کاری ضرب لگائی ہے۔ اس فقرے کی جتنی زبردست کیفیت تھی اتنی ہی بڑی چوٹ کی ضرورت تھی' جو اقبال نے بڑی جرأت اور بے باکی سے لگائی۔

مولانا مدنیؒ نے ٹھیک کہا تھا کہ آج کل قومیں وطن سے بنتی ہیں' آج کی دنیا میں ایسا ہوتا ہے ـــــ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسلام بھی اس کو قبول کرتا ہے؟ مثال کے طور پر آج کل سارا معاشی نظام سود پر چلتا ہے' یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے' مگر یہ دیکھئے کہ کیا اسلام بھی اسے قبول کرتا ہے؟ بالکل نہیں۔ تو مولانا مدنیؒ کے بیان پر علامہ اقبال نے کہا :

عجم ہنوز نہ داند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست
سرود برسرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

یعنی ابھی تک عجم نے دین کے اسرار و رموز سمجھے ہی نہیں۔ ورنہ دیوبند جیسے بڑے

دار العلوم کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی کی طرف سے یہ چیز' کہ انہوں نے منبر پر کھڑے ہو کر یہ راگ الاپا ہے کہ ملت وطن سے بنتی ہے' محمد عربی ﷺ کے مقام سے کس قدر ناواقفی کی مظہر ہے۔ اپنے آپ کو محمد مصطفیٰ ﷺ کے قدموں میں ڈال دو' کیونکہ دین نام ہی مصطفیٰ ﷺ کا ہے۔ اگر وہاں تک نہ پہنچے تو یہ سراسر بولہبی یعنی ضلالت و گمراہی ہے۔ یعنی یہ پوری شریعت' پورے شعائر دینی' یہ سارے احکام اور اوامر و نواہی کا مجموعہ' یہ پورا تمدن' یہ پوری ثقافت تو قائم ہی محمد ﷺ کے بل پر ہے۔

اقبال کی اس گرفت پر پورے ہندوستان میں بڑا شور اُٹھا۔ مولانا مدنیؒ کے بہت سے عقیدت مند تھے۔ جمعیت علمائے ہند کا بہت بڑا حلقہ تھا۔ پھر مولانا مدنیؒ نے بھی وضاحت میں ایسی بات کہی کہ اقبال نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ انہوں نے پہلی بات تو یہ کہی کہ میں نے "ملت" نہیں "قوم" کہا ہے' آپ نے اپنے شعر میں "ملت" کہہ دیا۔ دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ میں نے یہ کہا تھا کہ ایسا ہوتا ہے' میں نے مشورہ تو نہیں دیا تھا' تلقین تو نہیں کی تھی۔ بہرحال یہ ایک ناپختہ بات تھی' اللہ ان کو معاف فرمائے۔ بعد ازاں آپس میں خط و کتابت ہوئی اور یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

پھر علامہ اقبال نے مولانا مدنیؒ کا نام لئے بغیر وطنیت کے اس تصور پر پہلے سے بھی بڑی چوٹ لگائی ـــــ ملاحظہ کیجئے ؎

اِس دَور میں مے اور ہے' جام اور ہے' جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے

اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے

جیسا کہ میں نے کہا علامہ اقبال حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کا ظل اور بروز ہے۔ چنانچہ ؎

"تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند
اب مناسب ہے تیرا فیض ہو عام اے ساقی"

کے مصداق تین سو سال بعد اب یہ فیض عام اقبال کے ہاتھوں جاری ہو رہا ہے۔

شیخ احمد سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اگلی صدی کے مجدد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ، جیسا کہ پہلے بیان ہوا، رجوع الی القرآن ہے۔ انہوں نے قرآن کو جو بند تھا، کھول دیا، اور اس صدی کا سب سے بڑا داعی قرآن جس پر قرآن کی عظمت کا سب سے زیادہ انکشاف ہوا وہ ہے اقبال۔ اس حیثیت میں وہ بروز ہے شاہ ولی اللہؒ کا۔ دیکھئے امت مسلمہ کے زوال کا سبب کس قدر سادہ انداز میں تشخیص کر رہا ہے ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

اقبال کے اشعار کے اندر ایک تاثیر ہے۔ اس لئے کہ دراصل وہ قرآن و حدیث کی تعبیر کر رہے ہیں۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اِنَّ اللّٰہَ یَرْفَعُ بِھٰذَا الْکِتَابِ اَقْوَامًا وَّیَضَعُ بِہٖ آخَرِیْنَ)) "اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعے کسی قوم کو بلندی عطا کرے گا اور اس کتاب کو ترک کرنے کے باعث کسی کو ذلیل و رسوا کرے گا۔" اقبال نے فارسی میں کہا ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی
شکوہ سنج گردش دوراں شدی

یہاں بھی مہجوری کا لفظ قرآن ہی سے لیا ہے۔ سورۃ الفرقان میں ہے: ﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَھْجُوْرًا﴾۔ اقبال کے شعر کا مطلب ہے کہ تمہاری ذلت کا اصل سبب قرآن سے دوری اور روگردانی ہے اور تم خواہ مخواہ زمانے

کی گردش کا شکوہ کر رہے ہو کہ اس ذلت و رسوائی کا سبب یہ ہے۔ یہ خواہ مخواہ کے شکوے ہیں۔ اصل میں ع اے بادِ صبا این ہمہ آوردۂ تست۔ یعنی یہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے۔ پھر اقبال مسلمان قوم سے کہتا ہے ؎

اے چوں شبنم بر زمین افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

اے وہ قوم کہ شبنم کی طرح زمین پر پڑی ہے حالانکہ تیری بغل میں کتابِ زندہ (قرآن) موجود ہے۔ اس تمثیل پر غور کیجئے، شبنم انتہائی بے بسی کے عالم میں زمین کے گھاس پر قطروں کی صورت پڑی ہوتی ہے۔ لوگ، خاص طور پر جو صبح صبح سیر کو نکلتے ہیں، اسے اپنے پاؤں تلے روندتے ہیں۔ بالکل اسی طرح مسلمان قوم کو دوسری اقوام پامال کر رہی ہیں۔ پھر یہاں بغل کا لفظ بھی ایک تلمیح ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ ہوا۔ جادوگروں نے رسیاں پھینکیں تو وہ سانپ بن گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو بربنائے طبع بشری خوف محسوس ہوا کہ میرا عصا بھی سانپ بن جاتا ہے اور ان کی رسیاں بھی سانپ بن گئیں، اب کیا ہو گا۔ ﴿فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى﴾ اس جشن کے دن جب سب لوگ یہ مقابلہ دیکھنے آئے ہیں، کیا ہو گا؟ اللہ نے فرمایا: اے موسیٰ جو تمہارے ہاتھ میں ہے پھینکو۔ انہوں نے اپنا عصا پھینکا تو وہ بڑا سانپ بن گیا اور جادوگروں کے سانپوں کو ہڑپ کر گیا۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام بھول گئے تھے کہ اُن کی بغل میں کتنی بڑی چیز ہے اسی طرح مسلمان بھی بھولے ہوئے ہیں کہ قرآن کی صورت میں اُن کے پاس کتنی بڑی قوت ہے۔ اقبال کہتا ہے ؎

گر تو میخواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

(اگر تم چاہتے ہو کہ مسلمان بن کر زندہ رہو تو ایسا زندہ رہنا قرآن کے بغیر ناممکن ہے۔)

کون سا قرآن؟ اقبال خود ہی تعارف کراتا ہے :

حرفِ اُو را رَیب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

(اس کے حروف و الفاظ شک و شبہ سے بالا ہیں اور وہ بدل نہیں سکتے' اور اس کی آیتیں محتاج تاویل نہیں)۔

یہاں زورِ کلام ملاحظہ ہو۔ یہ زورِ بیان کرنے والے کی conviction کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ جس شخص پر کسی شے کی جتنی عظمت منکشف ہوگی اتنا ہی اُس کے کلام میں زور ہوگا۔ مثال کے طور پر ایک اُجڈ اور گنوار کے سامنے کسی بلند پایہ مصور کا فن پارہ رکھئے' وہ سرسری نظر ڈال کر گزر جائے گا' مگر جو شخص فن کی باریکیوں سے واقف ہوگا وہ عش عش کر اٹھے گا۔ پس اقبال کا زورِ کلام بتاتا ہے کہ وہ فہم قرآن کے کس مقام پر کھڑا ہے۔ اقبال مزید کہتا ہے ؎

آں کتابِ زندہ قرآن حکیم
حکمتِ اُو لایزال است و قدیم

(یعنی قرآن زندۂ جاوید کتاب ہے۔ اس کی حکمت ہمیشہ رہنے والی بھی ہے اور قدیم بھی ہے)

اقبال پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہے ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

(جو میرے دل میں ہے صاف صاف کہہ دیتا ہوں۔ یہ کتاب نہیں ہے کوئی اور ہی شے ہے۔)

یہ اور کیا ہے؟ یہ کلام الٰہی ہے! یوں سمجھئے کہ متکلم کی پوری شخصیت اُس کے کلام سے منعکس ہوتی ہے۔ کوئی بھٹیارا چند جملے بولے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ کوئی بھٹیارا بول رہا ہے۔ گنوار اور غیر مہذب شخص کی گفتگو اُس کے گنوارپن کا پتہ دے دے گی۔ مگر ایک عالم فاضل بولے گا تو اُس کے کلام سے فضیلت چھلکے گی۔ پس قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اس میں متکلم یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جملہ صفات کا انعکاس موجود ہے۔ چنانچہ فرمایا ؎

مثلِ حق پنہاں و ہم پیدا ست ایں
زندہ و پائندہ و گویا ست ایں

یہ رب کریم کی ذات کی طرح ہے اور اللہ تعالیٰ ظاہر بھی ہے باطن بھی ہے۔ ہمیشہ زندہ اور کلام کرنے والا ہے۔ اس کے ظاہر پر غور کرنے والا بھی مراد پا جائے گا اور اس کے باطن میں جھانکنے والا بھی اس کی عظمت کو پالے گا۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد' جہاں دیگر شود

جب یہ کسی کے اندر اتر جاتا ہے تو انقلاب لے آتا ہے۔ اُس کی سوچ بدل جاتی ہے' نظریات بدل جاتے ہیں' امنگیں اور خیالات بدل جاتے ہیں' اقدار بدل جاتی ہیں غرضیکہ سب کچھ بدل جاتا ہے۔ اُس کے اندر سے تبدیلی آتی ہے اور اب وہ بالکل بدلا ہوا (altogether changed) انسان ہو جاتا ہے۔ باہر کی تبدیلی تو ایک طرح کا بہروپ ہے۔ جونہی make up ختم ہو جائے گا اصلی چہرہ نظر آجائے گا۔ ضیاء الحق مرحوم نے ظہر کی نماز دفاتر میں پڑھنے کو کہا تو ملازمین مارے باندھے پڑھنے لگے' مگر عصر کے وقت تو صاحب جا کر سوئیں گے۔ یہ ہے بیرونی تبدیلی یا عارضی طور پر ڈالا ہوا نقاب۔ پس جب یہ قرآن کسی کے اندر اتر جاتا ہے تو اُس کی کایا پلٹ دیتا ہے۔

محولہ بالا شعر کے دوسرے مصرعے کے دو مطلب ہیں۔ پہلا یہ کہ جب انسان کا اندر بدل جاتا ہے تو اس کی دنیا ہی بدل جاتی ہے' اس کا نقطۂ نظر ہی بدل جاتا ہے' وہ غلط ماحول کے اندر قطعی unfit ہو جاتا ہے۔ دوسرا معنی بھی ایک طرح سے پہلے معنی ہی کا نتیجہ ہے کہ اُس کی تبدیلی ماحول کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ انفرادی تبدیلی متعدی ہو کر پوری قوم کو اور پھر پوری دنیا کو بدل کر رکھ دے گی' کیونکہ قرآن کے مرد مومن کا مشن ہی یہ ہے کہ اسلام کو پوری دنیا میں غالب کیا جائے۔ پس قرآن کی تعلیمات کے زیر اثر افراد بدلیں گے تو قوم بدلے گی۔ تو گویا اس میں انقلابِ نبویؐ کا پورا process آگیا۔ قرآن مجید میں چار مقامات پر آیا ہے: ﴿یَتْلُوْا عَلَیْہِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْہِمْ وَیُعَلِّمُہُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ﴾ قرآن کی آیات اندر اترتی ہیں تو ذہن کھلتے ہیں۔ اندر کی گندگی' باطن کی نجاست دھل جاتی ہے اور انسان پاک صاف ہو کر پسندیدہ اخلاق کا حامل ہو جاتا ہے۔ کردار کی پستی ختم ہو جاتی ہے۔ آپ نے دیکھا اصلاح کا یہ عمل قرآن کے گرد ہی گھوم رہا

ہے۔ کونسا قرآن؟ جو محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

اس قرآن کے بارے میں علامہ کہتے ہیں ؎

ہست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ!

تم نے کبھی غور کیا قرآن کیا ہے؟ یہ سرمایہ دار اور سرمایہ پرست کے لئے موت کا پیغام ہے۔ قرآن دستگیری کرتا ہے غریبوں، محتاجوں، مسکینوں، بے کسوں کی اور بے سروسامان لوگوں کا سہارا بنتا ہے۔ دیکھئے، اسلام کے اولین قبول کرنے والے کون تھے؟ وہی غلام اور بے سہارا پسے ہوئے لوگ اور اسلام کے شدید ترین دشمن کون بنے؟ مکہ کے چوہدری اور سرمایہ دار۔ اپنے اشعار میں اقبال خواجہ کا لفظ سرمایہ دار کے لئے لاتے ہیں ؎

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دِہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!!

گویا سرمایہ دار نے مزدور کی رگوں کے خون سے سرخ شراب کشید کی ہے، جسے وہ شام کو بیٹھ کر پیتا ہے، کلب کے اندر یا اپنے گھر کے اندر۔ یہ لال پری مزدور کے خون سے ہی تو کشید کی ہوئی ہے۔ محنت غریب کی، خون پسینہ غریب کا، نتیجہ یہ کہ غریب محنتی کو پھر بھی دو وقت کی روٹی نصیب نہ ہو اور اُس کے بچے بھوکے پیاسے بیماریوں کا شکار ہو جائیں اور جاگیردار اور سرمایہ دار عیش کریں۔ اقبال نے معاشرے سے اس طبقاتی تقسیم کو ختم کرنے اور عدل اجتماعی کے نفاذ کے لئے انقلاب اور انقلاب ہی کا نعرہ لگایا ہے۔ اقبال کے یہ دو شعر تو عجیب کیفیت کے مظہر ہیں ؎

گفتند جہانِ ما آیا بتو می سازد؟
گفتم کہ نمی سازد، گفتند کہ بر ہم زن!

(اللہ نے مجھ سے پوچھا کہ اے اقبال میں نے تمہیں اس دنیا میں بھیجا ہے' میری یہ دنیا تمہیں اچھی بھی لگی؟ میں نے جواب میں کہا کہ نہیں لگی! اس پر اُس نے مجھے حکم دیا کہ اسے درہم برہم کر کے رکھ دو)

یہ ہے انقلاب کی حقیقت۔ کوئی حساس اور ذہین آدمی اس معاشرے میں آنکھ کھولتا ہے تو کیا دیکھتا ہے۔ ناانصافی' وسائل پیداوار کی غلط تقسیم' اونچ نیچ' ظلم و زیادتی' استحصال' انسان انسان کا خون پی رہا ہے' انسان نے انسان کو غلام بنایا ہوا ہے' قوموں نے قوموں کو غلام بنا رکھا ہے' یہودی پوری دنیا کا خون کشید کر کے اپنے بینکوں میں اکٹھا کر رہے ہیں' یوں پوری دنیا ان کی مقروض ہے۔ حساس انسان اس صورتحال کو کیسے برداشت کرے گا؟ وہ تو نظام کی تبدیلی چاہے گا۔ اسی کا نام انقلاب ہے۔ اور انقلاب کا عمل اقبال کے نزدیک اس طرح ہے ؎

با نشّہ ٔ درویشی در ساز و دما دم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

پہلے تو درویشی اختیار کرو' دعوت و تبلیغ کا کام کرتے رہو' ہر طرح کی باتیں سنو' مگر اِدھر کان نہ دھرو' اپنی دُھن میں لگے رہو۔ دعوت و تبلیغ کے نتیجہ میں جو لوگ اکٹھے ہوں اُن کی تربیت و تزکیہ کیا جائے۔ وہ لوگ حرام کو چھوڑ دیں' گندگیوں سے منہ موڑ لیں۔ بدعات و اوہام اور شرکیہ عقائد سے تائب ہوں۔ مختصراً ان سب کی اپنی زندگی کے اندر اور گھر کے اندر اسلام نافذ ہو جائے۔ اس process میں لوگ پاگل کہیں گے' دقیانوسی اور پرانے خیالات والا ہونے کا طعنہ دیں گے۔ مگر یہ سب کچھ برداشت کرنا اور جھیلنا ہے۔ یہاں تک کہ ایذا رسانی کا مرحلہ بھی آئے گا مگر ہاتھ نہیں اٹھانا۔ مکے میں حضور ﷺ کی سیرت کے بارہ سال اسی نہج پر گزرے ہیں۔ یہ پوری کیفیت اقبال نے ایک مصرعے میں بیان کر دی ہے ؎

با نشہ ٔ درویشی در ساز و دمادم زن

اب اگلا مرحلہ ہے کہ جب تیار ہو جاؤ' مضبوط طاقت بن جاؤ' معتدبہ تعداد میں ایسے لوگ جمع ہو جائیں جو اپنی ذات اور اپنے گھر میں اسلام نافذ کر چکے ہوں اور وہ جانیں دینے کو

تیار ہوں' ایک امیر کا حکم ماننے کو تیار ہوں' تو اب بیٹھے نہیں رہنا بلکہ پوری طاقت کے ساتھ باطل سے ٹکرا جاؤ۔ یہ سارا process اقبال نے دوسرے مصرعے میں بند کر دیا ہے ؎

چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

میری کتاب "منہج انقلاب نبویؐ" علامہ کے اسی ایک شعر کی شرح ہے۔ حقیقت میں میں نے یہ چاروں مراحل دعوت' تربیت' تنظیم اور صبر محض سیرت النبی ﷺ کے مکی دور سے لئے ہیں۔ پھر ہجرت کا مرحلہ آیا۔ حضورؐ اور آپ کے جان نثار ساتھی مدینہ پہنچ گئے۔ اب باطل سے ٹکراؤ کا مرحلہ آگیا اور اس کا آغاز محمد ﷺ نے کیا۔ کفر کے ساتھ خوب پنجہ آزمائی کی اور بالآخر آپؐ کی حیات مبارکہ میں جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلام غالب آگیا۔ خلفائے راشدین کے دور میں غلبۂ اسلام عرب سے باہر دور دور تک ہو گیا۔ پھر اس کے بعد زوال شروع ہوا۔ ہندوستان میں یہ زوال اکبر اعظم کے دور میں اپنی انتہا کو پہنچا۔ وہیں سے اس کی ایک upward movement شروع ہوئی جس کے گل سرسبد شیخ احمد سرہندی' شاہ ولی اللہ دہلوی' سید احمد بریلوی اور مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہم اللہ تھے۔ اس کے بعد اسی تحریک کا نیا سلسلہ چلا' جس کی اہم شخصیت اقبال ہیں۔ یہ شخص مدرسوں' دارالعلوموں کا پڑھا ہوا نہیں۔ خانقاہوں کا تربیت یافتہ نہیں۔ یہ تو مشن سکول اور مرے کالج سیالکوٹ اور گورنمنٹ کالج لاہور کا پڑھا ہوا تھا۔ پھر جرمنی اور انگلینڈ کی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم رہا۔ مگر فکر اسلامی کی تجدید اس کے ہاتھوں ہوئی۔ سیکولرزم پر کاری ضرب اس نے لگائی۔ نیشنلزم کا سر اس نے کچلا۔ دین کو مسخ کرنے کا جو فتنہ دوبارہ اٹھا تو شیخ احمد سرہندیؒ کے بروز کی حیثیت سے اس کا خاتمہ اقبال ہی نے کیا۔ پھر دعوت رُجوع اِلی القرآن کو امام الہند شاہ ولی اللہؒ نے ایک مقام تک پہنچایا تھا۔ علامہ اقبال نے اس کو آگے بڑھایا اور پورے زور سے اس کا پرچار کیا کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اب آیئے ہندوستان کی تحریک آزادی کی طرف۔ ہندوستان پہلے دار الاسلام تھا' یہاں

مسلمانوں کی حکومت تھی' جو کمزور ہوئی تو طوائف الملوکی کی صورت بن گئی۔ اسی دوران باہر سے انگریز آ گئے اور ہوتے ہوتے انگریز پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ انگریزی تسلط سے نجات کے لئے جو تحریکیں اٹھیں وہ ناکام ہو گئیں' سید احمد بریلویؒ کی انقلابی جدوجہد ناکام ہوئی اور حضرت شیخ الہندؒ کی ریشمی رومال کی تحریک بھی ناکام ہو گئی۔ اب سوال یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کا کیا بنے گا؟ ایک حقیقت پسندانہ بیان تو وہ تھا جو ابوالکلام آزاد نے دیا کہ آزادی کی جدوجہد میں کوئی مدد نہ افغانستان سے ملے گی اور نہ ہی ترکوں سے۔ یہ بات ابوالکلام نے ۱۹۱۵ء میں کہی اور صحیح کہی۔ دوسرا حقیقت پسندانہ تصور علامہ اقبال کی سمجھ میں آیا۔ وہ یہ کہ پورے ہندوستان کا اور ہندوستان بھر کے مسلمانوں کا معاملہ tackle کرنا تو ہمارے لئے آسان نہیں' البتہ ہندوستان کی تقسیم کرا کے اگر اس کے شمال مغربی حصہ میں ایک اسلامی ریاست قائم ہو جائے جہاں مسلمان اکثریت میں ہوں تو وہاں اس بات کا امکان ہے کہ اسلام کو اس کی اصل حالت میں قائم کرنے کی دوبارہ کوشش کی جائے جس شکل میں محمد عربی ﷺ نے اس کو جزیرہ نمائے عرب میں قائم کیا تھا۔ یہ ہے فکر اقبال اور یہ ہے نظریۂ پاکستان۔

اس پس منظر سے یہ معلوم ہوا کہ ایک سوچ یہ بھی تھی کہ مسلمان ہندو سے مل کر انگریز کو نکالیں' بعد میں ہندو سے نمٹ لیں گے۔ مگر بعد میں کیا نمٹیں گے؟ ہندو تین چار گنا زیادہ منظم' زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ سرمایہ دار تھا' مسلمان اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا' حقیقت کے اعتبار سے یہی نظر آ رہا تھا۔ اس لئے اقبال کو جو بات سمجھ میں آئی وہ یہ کہ ہندوستان کی تقسیم ہو۔ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الٰہ آباد میں انہوں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ تقدیر مبرم ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک آزاد مسلمان ریاست قائم ہو گی (اُس وقت مشرقی حصہ علامہ کے ذہن میں نہ تھا) اور اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں موقع مل جائے گا کہ اسلام کی تعلیمات پر عرب ملوکیت کے دور میں جاگیرداری' سرمایہ داری اور قبائلی عصبیت کے جو پردے پڑ گئے تھے ان کو ہٹا کر صحیح اسلام کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔ جہاں تک اسلامی عبادات کا تعلق ہے ان سے مسلمانوں کو ہندوستان میں کوئی نہیں روکتا تھا۔ انگریز کی چھاؤنیوں کے اندر نمازیں پڑھی جاتی تھیں' اذانیں دی جاتی

تھیں۔ اصل مسئلہ تو اسلامی ریاست کے قیام کا تھا۔ چنانچہ تحریک پاکستان کے نتیجہ میں پاکستان وجود میں آیا۔

تحریک پاکستان کے حوالہ سے یہ سارا عمل دو عظیم شخصیتوں کا مرہون منت ہے۔ ایک علامہ اقبال' دوسرے قائداعظم محمد علی جناح۔ لیکن ان کے مابین ایک امتیاز ہے جو عام طور پر لوگ پیش نظر نہیں رکھتے۔ وہ یہ کہ اقبال مفکر پاکستان' مصور پاکستان اور مبشر پاکستان ہیں جبکہ قائداعظم معمارِ پاکستان' مؤسس پاکستان اور بانی پاکستان ہیں۔ دونوں کو اپنی اپنی جگہ رکھئے' ورنہ ظلم ہو گا۔ عربی میں ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو اُس کے صحیح مقام سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ دینا۔ اس طرح اگر قائداعظم کو مفکر کہیں گے تو ظلم ہو گا۔ وہ نہ مفکر تھے نہ فلسفی' وہ سیاست دان تھے' بات کے پکے تھے' ان کا ظاہر اور باطن ایک تھا اور ان کی گفتگو میں کوئی ایچ پیچ نہ ہوتا تھا۔ ایک طویل عرصے تک تو وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے کوشاں رہے مگر انہوں نے ہندوؤں کے قریب ہو کر دیکھ لیا کہ ان سے انصاف کی توقع نہیں کی جاسکتی چنانچہ وہ مایوس ہو کر واپس آ گئے۔ اب اُن کے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا یعنی مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے غلبے سے بچانا۔ قیام پاکستان کے وقت ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان تھے' ساڑھے چھ کروڑ پاکستان آ گئے' باقی ساڑھے تین کروڑ ہندوستان میں رہ گئے۔ اس طرح قیام پاکستان کے نتیجہ میں دو تہائی مسلمان ہندو اکثریت کے غلبے سے نجات پا رہے تھے۔ یہ مسلمانوں کا دفاع تھا' تاکہ مسلمانوں کا تمدن' تہذیب اور ثقافت مٹ نہ جائیں اور ہندو انہیں اپنے اندر جذب نہ کر لے۔ کیونکہ تاریخ میں ہندو تہذیب کی ایک بڑی خصوصیت یہ سمجھی گئی ہے کہ یہ دوسری تہذیبوں کو اپنے اندر ضم کر لیتی ہے اور اگر کوئی ضم نہ ہو تو اسے نکال باہر کرتی ہے۔ دیکھئے بدھ مت ہندوستان میں پیدا ہوا مگر یہاں سے اس طرح نکالا گیا کہ اس کا یہاں نام و نشان تک نہیں ہے۔ بدھ مت والے چین میں ہوں' کمبوڈیا میں ہوں' کہیں بھی ہوں مگر ہندوستان میں نہیں ہیں۔ یہ تو صرف اسلام ہے جسے ہندوازم اپنے اندر assimilate نہیں کر سکا۔ افسوس کہ مسلمانوں نے بھی کوتاہی کی۔ یہاں اگر انہوں نے دعوت و تبلیغ کا فریضہ انجام دیا ہوتا تو یہاں ہندو نام کی کوئی شے باقی نہ رہتی۔ مگر مسلمانوں نے عیاشیاں کیں' بدمعاشیاں کیں' محل بنائے بلکہ

تاج محل بنائے۔ پس جو ہم نے بنایا وہ بن گیا' جو نہیں بنایا نہیں بنا۔ الغرض اب اگر یہ ملک ایک وحدت کی حیثیت سے آزاد ہوتا تو عددی اکثریت کے فیصلہ کن ہونے کی وجہ سے ہندو غالب رہتے اور مسلمانوں کا تشخص ہی ختم ہو جاتا۔

اقبال نے احیائے اسلام کی آواز بلند کی[1]۔ قائداعظم نے مسلمانوں کے دفاع کی کوشش کی۔ اس پورے عمل کا نام تحریک پاکستان ہے۔ قائداعظم کے سامنے دفاعی پہلو زیادہ تھا' احیائی کم۔ مگر جب تحریک شروع ہوئی تو اسلام کا نام لینا ناگزیر تھا کیونکہ اسلام کا نام لئے بغیر مسلمان اکٹھے نہیں ہو سکتے تھے۔ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ اِلا اللہ!" کا نعرہ نہ لگتا تو مسلم لیگ کو اسمبلی کے اندر مینڈیٹ کیسے مل جاتا؟ لہٰذا قائداعظم کے ایسے بیانات آپ کو مل جائیں گے کہ اسلام ہمارا constitution ہے جو چودہ سو سال پہلے طے ہو چکا ہے۔ مگر قائداعظم کا اپنا ایک مزاج تھا' اپنی ایک ذہنیت تھی' اور وہ پاکستان بنتے ہی ظاہر ہو گئی جب انہوں نے کہا :

> *..... you will find that in the course of time Hindus would cease to be Hindus and Muslims would cease to be Muslims, not in the religious sense, because that is personal faith of each individual, but in the political sence as citizens of the State.*

یہ سیکولرزم نہیں تو اور کیا ہے؟ قائداعظم کی منزل تو حاصل ہو گئی کہ مسلمان ہندو کے تسلط سے نکل آیا۔ لیکن اگر اس ذہنیت کو پاکستان کی تعمیر کے لئے بنیاد بنائیں گے تو یہ درحقیقت تصورِ پاکستان کی نفی ہے۔ نقشہ آرکیٹیکٹ بناتا ہے' تعمیر معمار کرتا ہے۔ معمار قائداعظم ہیں' اقبال نہیں۔ وہ سیاست کے اندر کوئی مقام ہی نہیں رکھتے تھے۔ وہ تو مسلم لیگ کے ادنیٰ کارکن رہے' انہوں نے صوبائی شاخ کا صدر رہنا گوارا کیا۔ البتہ فکر اور احیائی جذبہ تو اقبال ہی کا ہے۔ پس نظریہ پاکستان کے حوالے سے ہمیشہ توجہ اقبال کی

---

(۱) ایران کے مشہور شاعر ملک الشعراء بہار علامہ اقبال کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں

؎ عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت' واحدے بر صد ہزاراں بر گزشت

(ترجمہ) "موجودہ دور اقبال کا دور ہے' وہ ایک انسان تھا مگر لاکھوں پر بھاری تھا"۔

طرف رہنی چاہئے۔ ہاں قائد اعظم کا بہت بڑا احسان ہے کہ اُن کی ولولہ انگیز قیادت اور کردار کی پختگی نے پاکستان بنوا دیا۔ ان دونوں چیزوں کو ساتھ ساتھ رکھنا بہت ضروری ہے۔ یہ "پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ" کا نعرہ ہی تھا کہ راس کماری سے درۂ خیبر تک اور چٹاگانگ سے لے کر مکران تک کے مسلمان قیام پاکستان کے مطالبہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے' اور ساتھ ہی "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" کا نعرہ تھا جس سے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کا وزن اس پلڑے میں پڑ گیا اور پاکستان معرض وجود میں آ گیا۔

اب ذرا تھوڑا پیچھے چلئے۔ علامہ اقبال شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے بھی بروز تھے۔ شاہ ولی اللہؒ کے وقت ہندوستان کا حال یہ تھا کہ ایک طرف سکھوں نے اودھم مچایا ہوا تھا' دوسری طرف مرہٹہ قوت زور و شور سے اُٹھی ہوئی تھی' پورا ہندوستان اس فتنہ کا شکار ہو رہا تھا۔ اس وقت دہلی کی ایک چھوٹی سی مسجد' مسجد شاہجہانی میں شاہ ولی اللہؒ کی صورت میں ایک مردِ درویش بیٹھا پورے ہندوستان کو دیکھ رہا تھا کہ یہاں کوئی مسلمان عسکری یا سیاسی راہنما کے طور پر ایسا نظر نہیں آتا جو اس خطرے کا مقابلہ کر سکے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ افغانستان سے ایک صاحب عزیمت شخص احمد شاہ ابدالی کو خط لکھ کر ہندوستان کی ابتر حالت اور صنم خانۂ ہند میں ملت اسلامیہ کو درپیش شدید خطرات سے آگاہ کرتے ہیں اور اُسے ہندوستان پر حملہ کی دعوت دیتے ہیں۔ چنانچہ اسی کے نتیجہ میں احمد شاہ ابدالی آتے ہیں' پانی پت کی تیسری جنگ ہوتی ہے جس کے نتیجے میں مرہٹوں کی قوت ختم ہو جاتی ہے اور اس کے اگلے ہی سال شاہ ولی اللہؒ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت اقبال دیکھ رہے تھے۔ ہندوستان کا مسلمان اس وقت leaderless تھا۔ قائد اعظم ہندوستان کے مسلمانوں سے اتنے مایوس اور بددل ہوئے کہ انگلستان جا کر پریکٹس شروع کر دی۔ ان کے الفاظ ہیں "میں ایسی قوم کی قیادت کیسے کروں جس کے بڑے بڑے لیڈروں کا حال یہ ہے کہ دن میں جو بات مجھ سے کرتے ہیں شام کو جا کر وہ گورنر کو بتا دیتے ہیں"۔ ایسے میں اقبال جناح کو persuade کرتے ہیں کہ واپس آ جائیں' آپ کے سوا یہاں کوئی نہیں جو اس وقت قیادت سنبھال سکے۔ اقبال کا یہ بلاوا اس قدر خلوص و اخلاص پر مبنی اور اتنا زوردار تھا کہ جناح وطن واپس آ گئے۔

علامہ اقبال کی فکری وراثت

میں نے ۱۹۹۴ء میں ایک سلسلہ مضامین تحریر کیا تھا' جس میں ان مراحل کا ذکر کیا تھا جن سے گزر کر ہندوستان میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل ہوئی۔ یہ کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ مگر بعد ازاں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مرحوم نے اپنے انتقال سے چند ماہ قبل اقبال کی زندگی کا اہم راز صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا۔ علامہ اقبال یہ سمجھ چکے تھے کہ خالص قومی تحریک کے نتیجے میں اسلام کا احیاء نہیں ہو سکتا' اس کے لئے کسی اور قسم کی تحریک درکار ہے' مگر اس کے لئے جس قسم کی ہمت درکار تھی وہ اپنے اندر نہ پاتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس طرح کا غیبی اشارہ پچیس برس پہلے مجھے ہوا تھا' جب میں انگلستان میں تھا۔ اب پھر چند سال پہلے اسی طرح کے غیبی اشارات مجھے ہوئے۔ میں نے اس ضمن میں تھوڑی سی کوشش بھی کی مگر قابل اعتماد لوگ مفقود تھے' لہٰذا بات جلد ہی ختم ہو گئی۔ وہ بات یہ تھی کہ "اسلام کے نام پر ایک ملک حاصل کر لینا بالکل اور شے ہے اور اسے واقعتاً اسلامی ریاست بنا دینا' اس میں نظام خلافت قائم کر دینا' اس کے لئے کسی اور قسم کی جدوجہد درکار ہے۔ اس کے لئے تو ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو ایک امیر کی امارت پر قائم ہو جس سے بیعت کا تعلق ہو' جس میں شامل ہونے والے دین پر عمل کرنے کا اقرار صالح کریں۔ حتیٰ کہ امیر کو شوریٰ نامزد کرنے کا حق ہو مگر امیر شوریٰ کی رائے کا پابند نہ ہو"۔ یہ خط و کتابت ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۵ء تک کے چار سالوں میں ملتی ہے[۲]۔

چنانچہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے اکٹھے ہو کر مسلمانوں نے ایک آزاد مسلمان ریاست تو قائم کر لی مگر واقعتاً اس میں خلافت راشدہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کا نظام رائج نہیں ہو سکا۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ نعرہ تو یہ تھا کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" یعنی مسلم خواہ شراب پیتا ہو یا شراب کا ٹھیکہ چلاتا ہو اس سے کوئی غرض نہیں' نام مسلمانوں والا ہونا چاہئے۔ ایسی جماعت سے اسلام تو نہیں آ سکتا۔

---

(۲) اس کی تفصیل "علامہ اقبال کی آخری خواہش" نامی کتابچے میں ملے گی جو عزیزم حافظ عاکف سعید نے مرتب کیا ہے۔

علامہ اقبال کی آخری خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے جمعیت شبان الہند کے نام سے ایک جماعت بنی' اس کا دستور تیار ہوا' بیعت کا فارم بنا' اس کی امارت کے لئے علامہ اقبال کا نام تجویز ہوا' انہوں نے اسے قبول بھی کر لیا۔ بعد ازاں یہ تجویز ناکام ہو گئی اور بات آگے نہ چل سکی۔

اقبال نے خود کو دو پیروں کا مرید مانا ہے' ایک پیر مولانا روم' دوسرے اکبر الہ آبادی۔ میں علامہ اقبال کو اپنا مرشد فکری مانتا ہوں اور یہ اللہ کا فضل و کرم ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اقتدار کا آخری سورج غروب ہو رہا تھا یعنی جب اورنگ زیب عالمگیر کا انتقال ہوا' اس وقت شاہ ولی اللہؒ کی عمر پانچ' چھ برس تھی۔ بیسویں صدی میں فکری سورج علامہ اقبال کی صورت میں طلوع ہوا۔ جب یہ غروب ہو رہا تھا اس وقت میری عمر چھ برس تھی۔ میری سوچ اور فکر پر سب سے گہری چھاپ علامہ اقبال کی شاعری ہی کی پڑی ہے۔ میں نے پانچویں جماعت میں یہ شعر پڑھا تھا ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اور میری پوری زندگی کا رخ معین کرنے میں اس شعر نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔

اس صدی میں مسلمانان ہند کو صحیح فکری راہنمائی دینے کی ابتدا اقبال نے کی۔ اس کی تعمیل کی پہلی جدوجہد ابوالکلام آزاد نے ۱۳-۱۹۱۲ء میں حزب اللہ بنا کر کی۔ اس سلسلہ کی دوسری کوشش مولانا مودودی نے کی۔ یہاں بھی سمجھ لیجئے کہ اس جوہر قابل کی شناخت بھی اقبال ہی نے کی۔ ان کی عقابی نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ ایک باصلاحیت شخص ابوالاعلیٰ مودودی نامی حیدر آباد دکن کی سنگلاخ زمین میں بیٹھا ہوا ہے' چنانچہ اس کو وہاں سے بلا کر پنجاب کے زرخیز ترین علاقے ضلع گورداس پور میں لا کر بٹھایا۔ علامہ کی مہلت عمر ۱۹۳۸ء میں ختم ہو گئی اور ۱۹۴۱ء میں مولانا مودودی نے جماعت اسلامی بنائی' کیونکہ جمعیت شبان الہند کی تجویز تو کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ اقبال نے جناح کو انگلستان سے وطن واپس بلایا اور اقبال ہی نے مولانا مودودی کو دکن سے بلایا۔ میرے بڑے بھائی بیان کرتے ہیں کہ خود انہوں نے مولانا مودودی کی زبان سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ "جب تک

میں حیدر آباد میں تھا کوئی مجھ سے آکر یہ بھی نہیں پوچھتا تھا کہ تمہارے منہ میں کتنے دانت ہیں"۔ مولانا پنجاب آئے تو یہاں علامہ اقبال کی شاعری کا ہل چل مچا تھا' زمین زرخیز ہو چکی تھی۔ یہاں آکر مولانا نے اقامت دین کا بیج ڈالا۔ اس کام کے لئے ایسے لوگوں پر مشتمل جماعت بنائی جو خود دین پر عامل ہوں۔ نام جمعیت شبان المسلمین تھا مگر سارا نقشہ وہی تھا کہ یہ جماعت الیکشن میں حصہ نہیں لے گی' سیاست نہیں کرے گی' البتہ سیاسی معاملات میں راہنمائی کرے گی۔ مگر مولانا مودودی کی تشکیل کردہ جماعت میں بھی ایک کمی رہ گئی کہ یہاں بیعت کی بنیاد نہ تھی۔ حالانکہ ابوالکلام آزاد نے حزب اللہ بیعت ہی کی بنیاد پر بنائی تھی۔ اقبال کا جمعیت شبان المسلمین کا نقشہ بھی بیعت ہی کی بنیاد پر تھا۔

"علامہ اقبال کی آخری خواہش" کا آپ ضرور مطالعہ کریں تاکہ آپ کو معلوم ہو کہ اُن کے خواب کیا تھے۔ آج یہ خواب الحمدللہ تنظیم اسلامی کے نام سے پورے ہو رہے ہیں۔ اصل میں تو اللہ کی مشیت سے سب کچھ ہوتا ہے' انسان تو اس میں ذریعہ بنتا ہے۔ جیسا کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا "اے علی تمہارے ذریعے سے اللہ اگر کسی ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بڑی دولت ہے"۔ بہرحال اقبال کا ایک خواب' قیام پاکستان کا خواب تو قائداعظم کے ہاتھوں پورا ہوا۔ الحمدللہ کہ اُن کے دو خواب راقم الحروف کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے پورے کرائے۔

جیسا کہ پیچھے ذکر ہوا علامہ اقبال نے مولانا مودودی کو گورداس پور میں لا بٹھایا' جہاں چوہدری نیاز علی خان علامہ کے عقیدت مند تھے۔ وہ ضلع گورداس پور کے زمیندار تھے' انگریز کے دور میں محکمہ نہر میں ایس ڈی او تھے۔ وہ ریٹائرڈ ہو کر آئے تو علامہ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا کہ میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے کوئی مفید کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے لئے میرے پاس زمین ہے' میں وقف کرنے کو تیار ہوں' بتایئے کیا کروں؟ علامہ نے کہا ٹھیک ہے تم ٹرسٹ بناؤ' ایک ایسا ادارہ بناؤ جہاں گریجویٹ مسلمانوں کو رکھا جائے اور انہیں قرآن کریم کی تعلیم دی جائے' مگر وہاں ایسا عالم دین ہونا چاہئے جسے انگریزی زبان پر عبور حاصل ہو' وہ جدید افکار سے واقف ہو اور ذہنی اشکالات کو بھی حل

کر سکے۔ انہوں نے علامہ کے خیالات سے اتفاق کیا۔ چنانچہ دار الاسلام ٹرسٹ قائم ہو گیا' عمارتیں بن گئیں۔ اب عالم دین کی تلاش ہوئی۔ ہندوستان میں کوئی شخص ایسا نظر نہ آیا تو مصر کے قدیم اور مشہور دار العلوم جامعۃ الازہر کے ریکٹر کو لکھا کہ ہمیں ایک ایسا عالم دین فراہم کیجئے جو انگریزی پر دسترس رکھتا ہو اور قرآن پاک پر جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو مطمئن کر سکے۔ وہاں سے جواب آیا کہ ہمارے پاس ایسا کوئی عالم موجود نہیں۔ پس سکیم یہیں ختم ہو گئی۔ اب اس عمارت میں مولانا مودودی کو بٹھایا گیا۔ پھر وہاں جماعت اسلامی کا مرکز بن گیا۔ بعد ازاں مولانا مودودی نے اسی طرح کی سکیم بنا کر راولپنڈی میں ادارہ قائم کیا جہاں گریجویٹس کو قرآن پڑھایا جائے اور عربی کی تعلیم دی جائے۔ اس کے لئے مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبد الجبار غازی صاحب راولپنڈی منتقل بھی ہو گئے تھے' لیکن اس کے بعد مولانا نے اپنی سیاسی مصروفیات اس قدر بڑھالیں کہ وہ ادارہ بھی ختم ہو گیا۔ مولانا کے سیاسی میدان میں کود پڑنے سے سارے افرادی اور مادی وسائل سیاست میں استعمال ہو گئے اور تعلیمی منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ بہرحال اللہ کے فضل و کرم سے ۱۹۶۷ء میں اللہ نے وہ خواب مجھے دکھایا۔ چنانچہ میں نے قرآن اکیڈمی کا نقشہ پیش کیا۔ ۱۹۷۲ء میں انجمن خدام القرآن وجود میں آئی اور ۱۹۷۷ء میں لاہور میں قرآن اکیڈمی قائم ہوئی جس کے بطن سے دس سال بعد ۱۹۸۷ء میں قرآن کالج بر آمد ہوا۔ الحمدللہ اب ہم گریجویٹس' پوسٹ گریجویٹس' پی ایچ ڈی' ڈاکٹرز اور انجینئرز کو قرآن کی تعلیم دے رہے ہیں۔ ہمارے پاس امریکہ سے بھی کچھ حضرات بیوی بچوں سمیت اور کچھ نوجوان انفرادی طور پر آئے ہیں۔ یہ لوگ اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ڈاکٹر اور انجینئر ہیں' جو قرآن سیکھ رہے ہیں اور عربی پڑھ رہے ہیں۔

دعوت رجوع الی القرآن کا یہ کام برعظیم پاک و ہند میں شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے شروع کیا' پھر ان کے بیٹوں نے اس کام کو آگے بڑھایا۔ پھر اللہ نے ہمیں توفیق دی کہ اس کام کو جاری رکھیں [۳]۔ ہمارا ہدف یہی ہے کہ جدید تعلیم یافتہ لوگ جو اعلیٰ صلاحیتوں کے

---

(۳) اس کی تفصیل راقم کی کتاب "دعوت رجوع الی القرآن کا منظر و پس منظر" میں ملاحظہ ہو۔

حامل ہوں، فکر جدید کے ساتھ فکر قدیم سے بھی وابستہ ہوں، اسلاف سے ساتھ ان کا تعلق مضبوط ہو، جدید سائنس اور جدید فکر کے حوالے سے وہ آج کی تمام بلندیاں سر کریں۔ ایسے نوجوانوں کا پیدا کرنا ہماری الیڈمیز کا مقصد ہے اور اسی لئے انجمن ہائے خدام القرآن کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔

۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم ہوئی جس کی بنیاد بیعت پر ہے۔ مجھے ۱۹۹۵ء تک معلوم نہ تھا کہ اقبال شخصی بیعت اور امیر کی امارت کے قائل تھے۔ میں صرف یہ جانتا تھا کہ انہوں نے بہت بڑا ایثار کیا کہ مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور قائد اعظم کے ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے محنت سے کام کیا [۴]۔ بہر کیف بیعت کی بنیاد پر ایک تنظیم کا قیام بھی علامہ اقبال کی خواہش تھی جو راقم الحروف کے ہاتھوں بفضل ایزدی پوری ہو رہی ہے۔ تنظیم اسلامی کے نام سے ہم نے جو قافلہ بنایا ہے وہ امارت اور بیعت کی بنیاد پر ہے۔ اس میں وہ لوگ جمع ہو رہے ہیں جو اپنا تن من دھن قربان کرنے کو تیار ہیں تاکہ غلبۂ اسلام کا دور آ جائے اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ قائم ہو جائے۔ اسی کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

میر عرب کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے
میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے

ہم اس مضمون کی احادیث بھی عام کر چکے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا اللہ تعالیٰ نے الف ثانی یعنی دوسرے ہزار سال کے مجددین کے لئے یہی علاقہ منتخب فرمایا۔ پہلے مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی، پھر شاہ ولی اللہ، سید احمد بریلوی، شیخ الہند، علامہ اقبال، ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمہم اللہ اور پھر تنظیم اسلامی و انجمن خدام القرآن۔ یہ سلسلہ "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" کے مصداق یہاں تک پہنچا ہے۔ اب رفتہ رفتہ مزید آگے بڑھنے اور اوپر چڑھنے کے لئے مردان کار اور باہمت نوجوانوں کی ضرورت ہے جو غلبۂ اسلام کی جدوجہد میں لگ جانے کو اپنی سعادت سمجھیں اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام کو اپنا مقصد حیات قرار دے لیں۔ بقول اقبال ؎

{۴} اس کی تفصیل راقم کی کتاب "علامہ اقبال اور ہم" میں موجود ہے۔

(باقی صفحہ ۶۱ پر)

”خیریتِ تعلّم و تعلیمِ قرآن“
اور ہماری ذِمّہ داریاں

——— مختار حسین فاروقی ———

نبی اکرم ﷺ نے ایک ارشاد میں اس عنوان پر حد درجہ جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا: ”خیرکم من تعلم القرآن و علمہ“ یعنی ”تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن سیکھیں اور سکھائیں“۔ اس فرمانِ رسولؐ کی اہمیت اس پہلو سے اور بھی کئی گنا بڑھ جاتی ہے کہ یہ صحیح بخاری، صحیح ترمذی، صحیح ابی داؤد، صحیح ابن ماجہ اور مسند احمد بن حنبل میں وارد ہوا ہے۔ مزید برآں اس حدیث کے راوی جماعت صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں سے بھی چوٹی کے صحابہ ہیں جن میں سے یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔ ابن ماجہ میں یہ روایت حضرت سعدؓ سے بھی آئی ہے مگر لفظ ”خیرکم“ کی جگہ ”خیارکم“ آیا ہے۔ اس لفظ خیر سے خیریت بمعنی مقابلتاً اعلیٰ اور بہتر ہونا ہے۔

اس حدیث پاک سے ماخوذ الفاظ اردو کے قالب میں جب ڈھلتے ہیں تو وہ ترتیب میں الٹ دیئے جاتے ہیں۔ یعنی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارکہ ہیں تعلّم و تعلیم قرآن۔ خود اکتساب علم پہلے ہے اور ہونا بھی ایسے ہی چاہئے اور تعلیم بعد میں ہے۔ مگر اردو میں یہ ترکیب تعلیم و تعلّم قرآن مستعمل ہے یعنی تعلیم پہلے اور تعلّم بعد میں۔ بظاہر تو یہ چھوٹا سا لفظی فرق یا سہو ہے مگر معناً بہت بڑا فکری تناقض ہے جو قرآن مجید سے دوری کا سبب ہے یا اس کے نتیجہ میں عام ہو گیا ہے۔ چنانچہ کوئی عجیب بات نہیں ہے جو ہم قرآن مجید کے ساتھ مسلمانان عام بالعموم کرتے ہیں کہ تعلیم کے بغیر ہی تعلّم ___ یعنی قرآن کے ناظرہ علم پر اکتفا، حقیقی علوم سے بے اعتنائی اور سب سے بڑھ کر اس پر دوسروں کو

اطمینان کہ ہم اللہ تعالیٰ کے کلام پاک کا حق ادا کر رہے ہیں۔ ہر محفل کا قرآن کریم کی تلاوت سے آغاز ہے' ہر عرس میں اس کی قراءت ہے' ہر سال حسن قراءت کے مقابلے ہیں' ہر اچھے برے' جائز ناجائز کاروبار کا آغاز اسی کتاب حق کی تلاوت سے ہے۔ عدالتوں میں قسم اٹھانے کے لئے موجود' بیٹیوں کے جہیزوں میں موجود' قریب الموت لوگوں کو سنانے کے لئے قرآن اپنے دل کے ساتھ (یعنی سورۂ یٰسین) موجود' گھروں میں برکت کے لئے موجود' دفع بلیات اور سفلی علوم کے توڑ کے لئے نوری نقش کے طور پر موجود' حتیٰ کہ تعویذ کے طور پر آیات لکھ کر ان کے بعض مکروہ اور توہین آمیز استعمالات کے لئے موجود۔ مگر نہیں ہے تو اس کے علم' اس کی زبان' اس کے معانی کے فروغ اور اس کے بطور منبع ایمان اور سرچشمہ یقین ـــــ کلام اللہ اور کتاب ہدایت کے طور پر نہیں ہے۔ فیا اسفا یا اولی الابصار۔

جب عوامی سطح پر تعلیم قرآن صرف ناظرہ پڑھانا مطمع نظر بن گیا اور حسن معنوی کے بجائے حسن ظاہری پر اکتفا کیا جانے لگا تو قراءت قرآن کے شاندار مظاہر تو سامنے آنے لگے مگر قرآن مجید کا معنوی پہلو ـــــ یعنی ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ.... تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ...﴾ والی شان اور ﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ والی کیفیت ناپید ہوتی چلی گئی اور قرآن مجید کی دعوت کا رنگ لئے ہوئے تفسیریں عنقا اور متکلمانہ موشگافیوں اور فقیہانہ بحثوں والی تفسیروں کی بھرمار ہو گئی۔ نتیجتاً اہل دل و اہل علم اور باصلاحیت مردان کار جو ع "قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلماں" اور ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

کی سی افتادِ طبع رکھتے تھے وہ قرآن سے دور ہوتے چلے گئے۔ اُمت میں "خَیْرُکُم" کے مصداق صرف بچوں کو ناظرہ پڑھانے والے یا حفظ قرآن کی خدمت پر مامور حضرات رہ گئے۔ مزید برآں چونکہ قرآن کا انسان کے باطن اور کردار سے کوئی تعلق نہ رہا تو ان حضرات کا کردار بھی آہستہ آہستہ قرآن سے دور ہوتا چلا گیا جس کے مظاہر آئے دن

اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں اور جنہیں عوام بھی خوب جانتے ہیں۔ جس کی وجہ سے عوام کی نگاہ میں بھی علماء اور قرآن مجید کا وہ اعلیٰ مقام باقی نہ رہا۔

اسی صورت حال کا گزشتہ دو صدیوں میں یہ منطقی نتیجہ بھی نکلا ہے کہ باصلاحیت اور ذہین نوجوان نے دین کے حوالے سے خدمت کا راستہ بند پا کر اپنے لئے دُنیا کے میدان کا انتخاب کر لیا۔ انسان کے اندر "خود نمائی" کا جذبہ تو ایک بنیادی اور جبلی جذبہ ہے ہی اور ہر انسان کم و بیش اس کے زیر اثر ہے' اس سے انکار ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا فہیم عناصر اور ذہین اقلیت جو کسی قوم کا دماغ اور "حاصل" ہوتے ہیں وہ ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والے عناصر سے گھٹنا شروع ہو گئے۔ اس عمل اور ردعمل کا نتیجہ ایک طرف تو یہ نکلا کہ برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کی قیادت و سیادت دینی شخصیات کے ہاتھ سے آہستہ آہستہ نکل کر ۶۰۔۷۰ سال کے اندر اندر مغربی تعلیم یافتہ طبقات اور غیر دینی شخصیات کے ہاتھ میں چلی گئی اور دوسری طرف دینی تعلیم کے فقدان (صرف تہذیبی اور ثقافتی اثر جو نسلاً بعد نسلٍ باقی تھا وہی رہ گیا) اور مغربی تعلیم کے خدا ناشناس تصورات کی وجہ سے "فراستِ مؤمنانہ" والی مسلمان قیادت جو صرف مسلم کاز (Muslim Cause) کے لئے برسر پیکار ہو' کا قحط الرجال پیدا ہو گیا اور گزشتہ دو عشروں سے مسلمان اُمت کی زمام کار جن ہاتھوں میں ہے دینی اعتبار سے تو کسی (کم سے کم) معیار پر بھی شاید ہی پورے اتریں' دُنیوی اعتبار سے بھی Statesmanship کی صلاحیت سے اکثر و بیشتر عاری ہیں۔ چنانچہ سعودی عرب اور عرب ریاستیں (جو عالم اسلام کا ایک طرح بیت المال ہیں) خالص ملوکیت کا شکار ہیں اور امریکہ کے زیر اثر ہیں۔ ترکی' پاکستان اور بنگلہ دیش میں نوجوان قیادت کے نام سے نئے چہرے سامنے لائے گئے اور ان تینوں ممالک میں تاریخ میں پہلی مرتبہ مسلمان عورتوں کو اقتدار دلوایا گیا جسکے بھی خاص صیہونی مقاصد ہیں۔ ایران کی قیادت نے جرأت دکھائی' ملک میں شہنشاہیت کی جڑ کاٹ دی مگر ان کے فلسفۂ انقلاب اور اسلام کی تشریحات بیسویں صدی کے بالغ اور بیدار انسان کو بھی متأثر نہ کر سکیں اور نہ ہی عالم اسلام کی غالب اکثریت کو متأثر کر کے اس کی قیادت کا منصب حاصل کر سکیں۔

افغانستان میں طالبان کی نوخیز قیادت مستقبل میں کیا مقام حاصل کرتی ہے اور اسلام

کے حقیقی کاز کے لئے کیا خدمت کرتی ہے' اس کی کامیابی کے لئے دعا بھی کی جا سکتی ہے اور امید بھی' مگر اس پر کوئی تبصرہ کرنا قبل از وقت ہے۔

پاکستان کی موجودہ قیادت کا بھی کڑا امتحان ہے۔ مغرب کے صیہونی منصوبوں کے خلاف کھڑے تو ہو گئے ہیں اور ع "مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے" کے زیر اثر شاید کچھ پیش رفت بھی ہو جائے مگر اس پر بھی فی الحال تبصرہ ممکن نہیں۔ یہ دونوں مثالیں اوپر درج صورت حال کے خلاف نہیں ہیں بلکہ اسلام کے احیاء اور عالمی غلبے کی اُمنگ کی آئینہ دار ہیں کہ ایک رو بہ اصلاح Upward عالمگیر احیائی عمل جاری و ساری ہے۔

اس صورت حال کا علاج کیا ہے؟ اور تدارک کی تدابیر کیا ہیں؟ اس کے لئے سرخیل اُمتِ مسلمہ و افضل البشر بعد الانبیاء بالتحقیق کے اس اثر آفتاب اثر کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ((لا یصلح اخر ھذہ الامّۃ الا بما صلح بہ اولھا)) یعنی "اس اُمت کے آخری حصہ کی اصلاح نہیں ہو گی مگر اسی طرح جس طرح اس کے پہلے حصہ کی اصلاح ہوئی تھی"۔

اس پہلے حصہ کی اصلاح کیسے ہوئی؟ کیا کایا پلٹ ہوئی؟ اس میں کس چیز نے کیا کردار ادا کیا؟ بنیادی اور کلیدی حصہ کس چیز کا تھا؟ اس اصلاحی عمل کے لئے آج ہمیں کیا کیا چیزیں میسر ہیں؟ یہ سوالات اور اس طرح کے دیگر بہت سارے سوالات کے جوابات زیادہ عمیق اور مشکل نہیں ہیں اور یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ جناب محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی قائدانہ اور مدبرانہ صلاحیتوں کے علاوہ جو شئے اس اصلاح احوال کے لئے مؤثر تھی' وہ تھی قرآن مجید ـــــ کتاب اللہ۔

دورِ رسالتؐ میں تو رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی اور قرآن مجید ایک ناقابل تقسیم وحدت تھی۔ اس لئے کہ "کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰن" کے مصداق آپؐ کے اخلاق قرآن کا عکس کامل تھے۔ اور یوں کہنا بے جا نہ ہو گا کہ آپؐ قرآن مجسم تھے۔

اسی نکتہ کی شرح یہ ہے کہ آپؐ کا ہر عمل اور سرگرمی قرآن مجید کے محور کے گرد

گھومتی رہی۔ چنانچہ ـــــ

☆ آپ ﷺ لوگوں کو قرآن مجید ہی پڑھ پڑھ کر سناتے رہے جس کی تاثیر کے جادو اثر ہونے کے سبب لوگ آپؐ کے اس عمل کو جادو اور آپؐ کو جادوگر کا خطاب دیتے رہے۔

☆ آپ ﷺ کا انذار اور تبشیر، جو فرائض رسالت تھے، قرآن مجید ہی کے ذریعے سے تھے۔

☆ آپ کی طرف سے وعظ اور نصیحت (ذکر) بھی قرآن ہی کی بنیاد پر تھا۔

☆ رات کی تاریکی میں لمبی لمبی (نصف رات اور دو تہائی رات) نمازیں قرآن ہی کی دلسوز تلاوت اور اس پر غور و فکر پر مبنی ہوتی تھیں، جس کے لئے آپ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن مجید کو یاد کرلینا اپنی سعادت ہی سمجھتے تھے۔

☆ اخلاق و کردار کے میدان میں دلوں کے روگ اور بیماریوں کے لئے قرآن مجید ہی کو شفا قرار دیا گیا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تزکیہ نفس اسی قرآن مجید ہی کا مرہون منت تھا۔

☆ حتیٰ کہ مخالفوں کے ساتھ کشمکش، دلیل و برہان کی جنگ اور باطل نظریات کے توڑ کے لئے قرآن مجید ہی وہ واحد ہتھیار تھا جو نہ کبھی کند ہوا ہے اور نہ ان شاء اللہ ہوگا۔ قرآن کریم نے اس عمل کو "جہاد بالقرآن" کا نام دیا ہے۔

☆ مکی دور سے مدنی دور کی طرف پیش قدمی کا نشان راہ ہجرت کا واقعہ ہے۔ اس کے ساتھ اس معاشرہ کی تشکیل کا عمل شروع ہوا اور سماجی، معاشی، عدالتی، سیاسی اور جنگی میدانوں میں محمد رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو قرآن ہی کے تابع کر دیا۔ حتیٰ کہ دُنیا نے دیکھا کہ صلح و جنگ اور سیاست و زراعت (معاش) جیسے منہ زور اور آزاد شعبے بھی قرآن کے شکنجے میں کس دیئے گئے جس سے دُنیا کو عدل و انصاف، اخوت و مساوات اور اصول صلح و جنگ اور سیاست و درویشی کے لازوال اصول سمجھ میں آئے جس کی اس سے پہلے نظیر نہیں مل سکتی۔ چنانچہ محمد رسول اللہ ﷺ نے عام انسانوں کو قرآنی تربیت سے انسان کامل بنا دیا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ درویش صفت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُس وقت صحرائے عرب سے نکلے اور دُنیا کے ایک بڑے حصے پر چھا گئے۔ وہاں کے ملوکیت زدہ عوام اور سماج دشمن قانون کے شکنجوں میں کسے ہوئے لوگوں نے اسلام کے سایۂ عاطفت میں پناہ لی اور ایک رُبع صدی کے اندر دُنیا کی عظیم ترین سلطنت خلافتِ اسلامیہ کے نام سے قائم ہوگئی۔

اُس دورِ خلافت میں کامل مساوات انسانی، معاشی عدل اور اللہ کی حاکمیت زریں اصول تھے جس سے انسان کو عظمت ملی، مگر خلافت راشدہ کے آخری زمانے میں دشمنوں نے سازشیں کیں اور مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کردیا اور ہوتے ہوتے قرآن مجید پس پردہ چلا گیا۔

اگرچہ قرآن مجید کے پس پردہ چلے جانے سے قومی اور نسلی جذبے نے آگے بڑھ کر جگہ لی اور خلافت راشدہ پہلی صدی کے آخری عشروں میں عرب ملوکیت (Arab Imperialism) کا روپ دھار گئی، اور یوں اسلام کی نہ سہی مسلمانوں کی شان و شوکت برقرار رہی۔

مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے والے سازشی عناصر دراصل قرآن کو نظروں سے اوجھل کرنے اور مسلمانوں کی زندگیوں سے نکالنے کی سازش کررہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے شہید ہونا، جنگ صفین کے موقع پر قرآن کے فیصلے کو نہ ماننے کا اعلان اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قرآن پڑھتے ہوئے فجر کی نماز میں شہید کردیا جانا اس سازش کا پتہ دیتے ہیں۔ اس سازش کا دوسرا حملہ وہ تھا جو تقریباً ایک صدی بعد عباسی خلفاء کے دور میں قرآن کے "مخلوق" ہونے کے مسئلے کی صورت میں پیش آیا۔ قرآن کو بوسیدہ، از کارِ رفتہ اور ناقابل عمل پرانے زمانے کی چیز بنانے کی اس سے بڑی سازش آسان لفظوں میں ممکن نہ تھی، مگر اللہ تعالیٰ کو جو منظور تھا وہی ہوا یعنی نبی آخر الزماں ﷺ کی لائی ہوئی آخری ہدایت کو تاقیامت باقی رکھنا مشیتِ ایزدی اور حکمتِ خداوندی میں طے تھا لہٰذا وہ باقی رہا۔ مگر سازشیوں نے اپنی طرف سے کوئی کمی نہ چھوڑی۔ یہاں ناکامی کا منہ دیکھ کر اپنے مقاصد کے حصول یعنی قرآن کو مسلمانوں کی عملی زندگی سے نکالنے کے لئے دوسرے راستے اختیار کئے جس میں وہ بہرحال کامیاب رہے۔

اگرچہ حق پرست علماء اس فتنے کا ہر دور میں سدّباب کرتے رہے' خاک و خون میں لوٹتے رہے اور دار و رسن کو زینت بخشتے رہے' تاہم مسلمانوں کی عظیم اکثریت اس فتنہ کے سیلاب میں بہہ گئی اور صرف نام کی مسلمانی باقی رہ گئی۔

جو دعوت محمد ﷺ کی تھی وہی سابقہ انبیاء کرام علیہم السلام کی تھی' وہی دعوت قرآن مجید کی تھی۔ قرآن حکیم کے خلاف کام کرنے والے عناصر کون تھے؟ یہی سرمایہ دار' متکبر' بادشاہ' ظالم عیاش اور اپنے آپ کو دوسروں سے برتر سمجھنے والے حکمران۔ سابقہ ادوار میں ایسے لوگوں نے ہی نبیوں کو قتل کیا۔ یہود ان میں پیش پیش ہیں اور آسمانی صحیفوں 'تورات' انجیل و زبور کو ایسے لوگوں نے اپنی سازشوں سے دنیا سے غائب کر دیا کہ نہ حق کی آواز اٹھے گی نہ ان کی حکمرانی میں خلل آئے گا' نہ عوام جاگیں گے نہ حقوق کی بات ہوگی اور نہ ظلم و شرک کی کوئی پہچان رہے گی' نہ ان کے اقتدار کو کوئی چیلنج کرنے والا ہوگا۔ یہی لوگ ظالم حکمرانوں' ان کے نورتنوں' درباری علماء اور دنیا پرست صوفیوں کے روپ میں صدیوں سے اس کھیل میں مصروف رہے ہیں اور ان ہی کی کوششوں کی بدولت قرآن آہستہ آہستہ مسلمانوں کی زندگیوں سے نکل گیا اور بالآخر طاق نسیاں کی زینت بن گیا۔

تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں یا انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں جب انگریز برعظیم پاک و ہند میں قدم جمانے میں کامیاب ہوا تو اگرچہ حکمران نام کے مسلمان تھے اور عوام کے لئے اسلامی قوانین بھی محدود حد تک تھے جن کا اطلاق بہرحال امراء کے محلات پر نہیں ہوتا تھا تاہم علمائے حق کی کوششوں سے مسلمانوں کو ان کے دینی تصورات سے وابستہ رکھنے کی کوششیں ہر سطح پر موجود تھیں۔ اگرچہ مسلمانوں کا آج کے دور کی طرح کوئی منظم مرکزی محکمہ تعلیم تو نہ تھا مگر ناظرہ قرآن' دینی معلومات کے لئے عام فہم کتب' معراج نامہ' داستان امیر حمزہ اور قصہ یوسف علیہ السلام جیسی کتب سے لوگ اپنے مذہبی جذبات کی آبیاری کرتے رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کی آمد پر مسلمانوں میں تعلیم کی شرح ۸۴ % تھی (رپورٹ لارڈ میکالے) جو کہ آج تعلیم کے غلغلہ اور گلی گلی

سکولوں کی بھرمار کے باوجود پندرہ بیس فیصد سے زیادہ نہیں۔ سابقہ دور میں علم کے اس فروغ میں جس جس کا جتنا حصہ ہے اس کو اس کا کریڈٹ ضرور ملنا چاہئے۔

قرآن مجید کی مسلمانوں کے لئے اہمیت کے پیش نظر قرآن کے شیدائیوں نے ہر دَور میں قرآن مجید کی تعلیم پھیلانے کی سرتوڑ کوششیں کیں اور قرآن دشمنوں نے اس کو پسِ پردہ ڈالنے میں جان و مال کی بازی لگائی۔ اس کی تفصیل کچھ کتابوں میں محفوظ ہے اور باقی تاریخ کا حصہ۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے' اس کا راز تو آخرت میں ہی کھلے گا۔

لیکن یہ بات ببانگِ دُہل کہی جا سکتی ہے کہ ہمارا ۱۰۰۰۔ ۱۲۰۰ سال کا ماضی قرآن دوستی سے یکسر خالی نہیں رہا۔ ہزارہا علماء و صوفیاء نے زندگیاں کھپائی ہوں گی اور سینکڑوں کتابیں لوگوں کو قرآن کے قریب کرنے اور عوام تک پہنچانے کے لئے تحریر کی گئی ہوں گی جو امتدادِ زمانہ سے ہم تک نہیں پہنچ سکیں۔ اس کی ایک وجہ انگریز کی حکومت بھی ہو سکتی ہے جس نے مسلمانوں سے حکومت چھینی اور ہماری روایات اور ماضی کے سارے روشن نقوش مٹاڈالنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

آج کا دور بجاطور پر مغرب کی علمی' فکری' سیاسی اور عسکری بالادستی کا دور ہے۔ اگرچہ مغرب کی براہ راست غلامی سے ہم نے ۱۹۴۷ء میں گلو خلاصی حاصل کرلی تھی تاہم نصف صدی بعد بھی ہم ان کے تہذیبی اور ثقافتی ہی نہیں علمی و فکری سطح پر بھی غلام ہی ہیں۔ (اب ایٹمی دھماکہ نے شاید صورِ اسرافیل کا کام کیا ہے اور یہ مردہ قوم کچھ انگڑائی لے رہی ہے اور اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کا سوچ رہی ہے۔)

انگریز غیر ملکی حکمران تھے۔ ان کا مذہب' اقدار' سوچ' علمی وراثت اور تہذیب و ثقافت ہر چیز ہم سے مختلف تھی۔ اس کے پورے برعظیم پر غلبہ حاصل کرنے کے بعد سیاسی میدانوں میں تو آزادیِٔ وطن کی تحریکیں چلیں اور اس میں مذہب کا نام بھی لیا گیا' مگر خالص علمی و فکری میدان میں کماحقہ کام نہیں ہو سکا۔

تعلیمی میدان میں علی گڑھ اور دیوبند کی دو عظیم تحریکیں برعظیم کے مسلمانوں پر حد درجہ اثرانداز ہوئیں۔ علی گڑھ جدیدیت کا علمبردار اور مغرب کا مداح تھا۔ تاہم یہ

لوگ انگریزوں سے غیر مرعوب ہونے کی وجہ سے عوام کے دلوں کے قریب تھے' اگرچہ اس میں دین و مذہب اور قرآن کی تعلیم کا عنصر نہ ہونے کے برابر تھا۔ جبکہ دیوبند قدامت پرستی اور علوم انبیاء کا وارث ہونے کا دعویدار تھا' مگر معاشرے کے ایک غیر مؤثر طبقے تک ہی اس کی رسائی تھی اور Mass Scale پر عوامی رابطے سے تہی دامن تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز کے آنے کے بعد مسلمان خواص اور عوام دونوں میں سابقہ دینی اثر اور روایتی مذہبی اقدار کا اثر رفتہ رفتہ کم ہونا شروع ہوا اور اب تقریباً ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ اب اسلام کے عائلی قانون کی بھی کھلے عام تضحیک و توہین آئے روز اخبارات کی زینت بنتی رہتی ہے۔ اسی پر قیاس کر لیجئے دوسری اخلاقی قدروں کو جو کسی قوم کی کردار سازی میں بنیادی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں' بلکہ کردار کی جگہ اب منافقت نے لے لی ہے اور مسلمانوں میں' اِلّا ماشاء اللہ' جو جتنا بڑا رہنما ہے اتنا ہی بڑا منافق ہے۔

دوسری طرف انگریز کی مادی ترقی کے چکاچوند مظاہروں سے ہماری نئی نسلیں مغرب کی دلدادہ ہوتی چلی گئیں اور انہی کے تہذیبی و ثقافتی رنگ کو اختیار کرتی چلیں گئیں۔

گزشتہ دو صدیوں کے اس عرصے میں جب اسلام کی تہذیبی و ثقافتی اقدار زمین بوس ہو گئیں' مسلمانوں کی حکومتیں بھی نہ رہیں اور باقی رہیں بھی تو انگریزوں کی باج گزار ہو کر تو اوپر درج حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا وہ اثر جو آفتاب آمد دلیل آفتاب آمد کی طرح از خود واضح اور مدلّل ہے' کے تحت کئی اصحابِ درد میدان میں آئے اور انہوں نے اُمتِ مسلمہ کو جگانے اور اپنی اصل روایات کی طرف لوٹنے کا نعرہ لگایا۔ دُنیا کے دوسرے ممالک کے خلاف برعظیم پاک و ہند میں اس احیائی عمل میں قرآن مجید کو بجا طور پر محور بنایا گیا اور اس طرح اس علاقے میں اسلام کے عالمی غلبے کی جدوجہد میں قرآن کا عنصر شامل ہوا جس سے اس جدوجہد کو ایک گونہ نسبت دورِ نبوی علی صاحبہا الصلوۃ والسلام سے پیدا ہو گئی جس پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔

اس جِدّوجُہد میں علماء حق میں سے سرخیل ہیں شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ' جنہوں نے مالٹا کی اسیری سے رہائی پر وطن واپسی پر دیوبند میں علماء کے اجتماع میں فرمایا کہ میں جیل کی تنہائیوں میں ایک سبق سیکھ کر آیا ہوں اور وہاں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ بقیہ

زندگی عوامی دروس قرآن کے ذریعے عوام کو قرآن سے روشناس کراؤں۔ دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سرفہرست علامہ اقبال ہیں جن کی شاعری نے مسلمانوں کو جذبۂ ملی دیا۔ علامہ اقبال نے فرمایا ؎

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

اور ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

اور ؎

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست؟
زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
حکمتِ اُو لایزال است و قدیم

اس میدان میں مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۲۱ء تک گرجتے رہے، حتیٰ کہ دیوبند کی کوکھ سے جنم لینے والی جماعت (مراد تبلیغی جماعت) جو مولانا الیاسؒ کی قیادت میں ابھری، اس نے بھی فضائل قرآن کو خوب پھیلایا اور خوب یاد کرایا (اگرچہ آگے بڑھ کر قرآن کی تعلیم کو نہیں اپنا سکی)۔ مولانا مودودیؒ بھی اس میدان میں آئے اور ان کی تفسیر بلا مبالغہ عام فہم ہونے کے سبب دُنیا کی سب سے زیادہ چھپنے والی تفسیر ہے۔ گزشتہ تین عشروں سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہ اور ان کے ادارے بالخصوص انجمن ہائے خدام القرآن، قرآن کے علوم کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ تاہم ہنوز بہت سارا کام کرنا باقی ہے۔

آنے والے دنوں میں قرآن و حدیث کے اشاروں کے مطابق جو عالمی غلبۂ حق ہونے والا ہے اور اس کا نقطۂ آغاز اگر سرزمین پاکستان نے بننا ہے تو ایک بہت بڑا کرنے کا کام یہ ہے کہ قرآن کے علوم کو عوام تک پہنچا دیا جائے۔ آج کے عوام کی قرآن سے

دلچسپی کی کیفیت بڑی پریشان کن ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں ایک اندازے کے مطابق صرف پانچ فیصد لوگ باقاعدگی سے نماز ادا کرتے ہیں۔ ان میں سے باقاعدگی سے ناظرہ قرآن پڑھنے والے ۵/۳ ہوں گے اور ان میں سے بھی سمجھ کر پڑھنے والے شاید پانچ فی ہزار ہوں گے۔

یہ کیفیت اُمت کے بہی خواہوں اور دردمندوں کے لئے پریشانی کا باعث ہونی چاہئے۔ ان حالات میں کرنے کا کام یہ ہے کہ قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے والا ہر شخص اس فکر میں لگ جائے کہ دوسرے مسلمانوں تک قرآن کے علوم کو کیسے پہنچانا ہے۔ اس مقصد کے لئے اگر مسلمانان پاکستان کو دو حصوں میں تقسیم کرلیں، یعنی (۱) قرآن کو نہ سمجھنے والے اور (۲) قرآن کو سمجھ کر باقاعدگی سے پڑھنے والے، تو ذمہ داری اگرچہ ان دونوں طبقوں کی ہے، مگر پہلے طبقے کی آسانی ہے کہ اگر صحیح انداز سے اسے متحرک کردیا جائے تو وہ قرآن پڑھنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ زیادہ ذمہ داری دوسرے طبقے کی ہے جسے اس کام کے لئے زیادہ وقت کا ایثار کرنا پڑے گا اور مال کا ایثار بھی کرنا ہوگا۔ اس ضمن میں کئی کوششیں ہو رہی ہیں، مزید ہوں گی ـــــ مگر جب تک عوام تک قرآن کی دعوت کو پہنچانے کا کام عام نہیں ہو جاتا یہ کام کرتے رہنا ہوگا۔

قرآن مجید کو عوام تک پہنچانے اور پہلے مرحلے میں اسے کم از کم آج کے ہر میٹرک ایف اے پاس افراد کے ہاتھوں تک پہنچانے کے لئے ہمیں کئی کام کرنا ہوں گے جو درج ذیل ہیں:

(۱) ایسے فضائل قرآن کا بیان جو دو چار نشستوں کے بعد لوگوں میں ایسی اُمنگ پیدا کر دے کہ وہ بے خود ہو کر قرآن پڑھنے پڑھانے پر آمادہ ہو جائیں۔

(۲) ایسے مختصر دورانیہ کے کورسز (Short Courses) جو ایک چلہ، دو چلہ، تین چلہ یا چار ماہ، آٹھ ماہ اور ایک سال کے ہوں اور ان کورسز کی ترتیب ایسی ہم آہنگ اور ملک گیر ہو کہ کوئی شخص تین چلہ کے کسی قرآنی کورس میں ہمہ وقت داخلہ لے اور ایک چلہ کے بعد جاری نہ رکھ سکے یا کہیں تبادلہ ہو جائے تو کچھ عرصے بعد وہ دوسری جگہ دوسرا چلہ لگا سکے اور پھر اپنی فرصت کے مطابق تیسرا چلہ لگا کر قرآن فہمی کا

کورس مکمل کرلے۔

(۳) قرآن فہمی کے ان کورسز کے لئے ابتداء قرآن کے ترجمہ سے نہ کی جائے بلکہ ابتداء میں شرکاء کو عربی زبان کی تعلیم بطور عربی زبان (as a language) دی جائے تاکہ ان میں عربی کا ڈر ختم ہو اور قرآن آسان محسوس ہو' بصورت دیگر صرف "رٹا" (memorization) سے یہ معاملہ جلد ہی ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔

(۴) عربی زبان کی ترویج و تعلیم بھی مدارس کے روایتی طریق پر نہ کی جائے' بلکہ سکولوں اور کالجوں کے طالب علموں کے لئے (جنہوں نے انگریزی اور اردو کی گرائمر پڑھ کر امتحان پاس کرلئے ہوتے ہیں) انگریزی اور اردو کے تقابل میں عربی گرائمر کو آسان اور عام فہم انداز میں پیش کیا جائے تاکہ شرکاء میں وحشت پیدا نہ ہو' اور جہاں تک ممکن ہو فعل کی بجائے اسم اور حرف کی بحث پہلے پڑھائی جائے اور فعل کی بحث آخر میں۔

(۵) عربی زبان کی ترویج کے لئے عام فہم کتب کو رواج دیا جائے اور مختلف ملکی اداروں کو آسان عربی کتابیں لکھنے پر انعامات دیئے جائیں اور پھر اس طرح منتخب کتابوں کو شامل نصاب کیا جائے۔

(۶) عربی زبان کی ترویج کیلئے جدید ذرائع تعلیم از قسم بلیک بورڈ' وائٹ بورڈ' آڈیو اور ویڈیو کیسٹ اور کمپیوٹر ڈسک کو بھی استعمال میں لایا جانا ضروری ہے۔

(۷) قرآن فہمی کے لئے رہنما کتابیں شائع کی جائیں اور انہیں مختلف اداروں کی طرف سے سستا (Subsidize) کرکے فروخت کے لئے پیش کیا جائے۔

(۸) قرآن کے صرف برکت کی کتاب اور تعویز گنڈے کی کتاب ہونے کے تصور کو ختم کرنے والے کتابچے عام کئے جائیں اور ہو سکے تو وقت خرید کر ریڈیو اور ٹی وی پر پروگرام پیش کئے جائیں تاکہ قرآن فہمی کا ایک شوق اور جذبہ پیدا ہو سکے۔

(۹) عربی کے اس فروغ کو آج کے عمومی تصور "تعلیم ایک تجارت" کے انداز میں ہرگز نہ چلایا جائے بلکہ ایسے لوگ سامنے آئیں جو ایک داعی کی حیثیت سے اس کام کو آگے بڑھائیں اور ﴿وَمَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ﴾ کی شان کے ساتھ سامنے آئیں'

اور اگر کسی مدرس کو کہیں کوئی مشاہرہ دینا ہی پڑے تو ایسے ادارے اور انجمنیں وجود میں لائی جائیں جو اس کو ایک منظم انداز میں لے کر چلیں تاکہ یہ نیک کام دنیا پرست اور بدنام زمانہ لوگوں کے ہاتھوں میں جاکر بدنام نہ ہو جائے۔

(۱۰) قرآن فہمی اور قرآن شناسی کے عام اصول یکجا کر کے چھوٹے کتابچے کی شکل میں مرتب کئے جائیں تاکہ عام قاری کو یہ اصول آسانی سے مل سکیں اور وہ ان کو ازبر کر کے استفادہ کر سکے۔

(۱۱) اس مقصد کے لئے ہر قابل ذکر جگہ پر قرآنی تفاسیر اور لٹریچر کی لائبریریاں قائم کی جائیں تاکہ لوگ قریبی مراکز سے استفادہ کر سکیں۔

(۱۲) قرآن مجید کو ایسے لوگوں تک پہنچانا جو ناخواندہ ہیں زیادہ توجہ کا طالب اور کٹھن مرحلہ ہے۔ اس مرحلہ کے لئے درج ذیل کام ضروری ہیں۔ شاید کہ اس سے مقصد کے حصول میں آسانی ہو۔

i) شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ کے بقول گلی گلی اور محلہ محلہ دروسِ قرآن کی عوامی محفلوں کا اہتمام کیا جائے جن میں قرآن مجید کی آیات کی دعوتی انداز میں تشریحات کی جائیں۔ فقہی اور نظری مسائل کو زیادہ نہ پھیلایا جائے۔ قرآن کے فطری استدلال سے لوگوں کو روشناس کرانے کے لئے سخت محنت کی ضرورت ہے' اس لئے کہ آج کل ہمارے کان فقہی بحثوں' نور و بشر کے جھگڑوں' رفع یدین اور فاتحہ خلف الامام جیسے مسائل پر ڈھواں دھار تقریروں کے عادی ہو کر خراب ہو چکے ہیں۔ ایسے حالات میں مناظرہ بازی سے ہٹ کر خالص قرآن کے آفاقی دلائل کی بات پر لوگوں کو جمع کرنا لوگوں کے علمی ذوق کو بدلنے کے مترادف ہے جس کے لئے طویل محنت اور لگن کی ضرورت ہے۔

ii) قرآنی تعلیمات کو عوام تک پہنچانے کا دوسرا مؤثر ذریعہ خطبہ جمعہ ہے جس میں ہزار ہا لوگ آج بھی جمع ہوتے ہیں۔ خطباء کرام اور علماء سے گزارش کی جائے کہ وہ خطابات جمعہ میں قرآنی آیات اور مباحث کو موضوع بنائیں تاکہ قرآن فہمی کا ذوق بیدار ہو سکے' جو لوگوں کی Education اور ذہن سازی میں مدّ

ومعاون ہوگا۔

iii) اس مقصد کے حصول کے لئے تیسرا کام اگرچہ مشکل ہے مگر ناممکن نہیں۔ یہ کام ہے رمضان المبارک کی بابرکت راتوں میں قرآن مجید کا ترجمہ اور تشریح کرنا۔ اس کی مختلف شکلیں ممکن ہیں جو حسب ذیل ہیں۔ لوگ کوششیں کریں اور اپنی اپنی مساجد کے ائمہ، حفاظ، خطباء یا محلّہ کے اہل علم حضرات کو باصرار ترجمۃ القرآن کے کام پر آمادہ کریں :

(ا) تراویح سے قبل یا بعد قرآنی نصاب تراویح کے مضامین کا ۱۵۔ ۲۰ منٹ میں تعارف کرایا جائے۔

(ب) تراویح کے بعد قرآنی نصاب تراویح کا باقاعدہ بیٹھ کر ترجمہ کیا جائے اور اہتمام سے سنا جائے۔ یہ انتظام مسجد میں ہو تو بہتر ہے ورنہ کسی گھر میں بھی ہو سکتا ہے۔

(ج) تراویح کے بعد ترجمہ کے لئے کسی صاحب علم کو دعوت دی جا سکتی ہے اور اس مقصد کے لئے مختلف حضرات کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ مارکیٹ میں ملتے ہیں، ان سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

(د) جامع ترین شکل یہ ہے کہ تراویح کی چار رکعات سے قبل باقاعدہ قرآن کھول کر نصاب کا ترجمہ اور تشریح بیان کی جائے، جو ۴۵ منٹ سے زائد نہ ہو، پھر چار رکعات پڑھی جائیں۔ اس طرح ۲۰ رکعات (یا جہاں آٹھ رکعات پڑھتے ہیں وہاں اپنے حالات کے مطابق وقت کا تعین کر لیا جائے) مکمل کی جائیں۔ اس طرح رمضان المبارک کی تراویح میں ترجمۃ القرآن مکمل ہو سکتا ہے جو بہت بڑی سعادت ہے۔

اس طرح عوام تک براہ راست قرآنی علوم کا ذخیرہ افادۂ عام کے لئے پہنچایا جا سکتا ہے۔ شروع میں اس کام کے لئے اساتذہ کم ہوں گے اور سارے علماء بھی ہمت نہیں کریں گے مگر آہستہ آہستہ یہ کام پھیلے گا اور آسان ہوتا چلا جائے گا۔ تعلیم یافتہ حضرات کو قرآن سکھانے کا جو پروگرام درج ہے اس میں سے بھی جو حضرات قرآن سیکھتے چلے جائیں اس مبارک کام میں اپنے آپ کو لگاتے چلے جائیں تو یہ کام اللہ

تعالیٰ کی تائید و نصرت سے تھوڑے عرصے میں قریہ قریہ اور بستی بستی پھیل سکتا ہے۔

آخری بات جو بہت اہم اور اس جدید دور کے علماء قرآن پر عوام کی طرف سے "قرض" ہے جو جتنی جلد ادا ہو سکے اتنا ہی بہتر ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید سے استفادہ کیلئے عام فہم طریقہ نکالا جائے (Methodology tounderstandQuran) تاکہ قاری بھاری بھاری تفاسیر کے بوجھ اور متکلمانہ اور فقیہانہ بحثوں سے کم از کم ابتدائی مراحل میں بچ سکے۔ اس لئے کہ عام قاری تو علماء حق ہی کا قدر دان ہو گا' وہ قرآن پڑھ کر ان سے برگشتہ نہیں ہو گا بلکہ مشکلات کی صورت میں انہی کے پاس آئے گا' مگر آج کے قرآن پڑھنے والے کی مشکل یہ ہے کہ علماء کسی تفسیر سے متعارف کرا دیتے ہیں اور وہ قاری اس کی بحثوں میں پھنس کر کسی کنارے پر پہنچے بغیر یا تو قرآن سے دور ہو جاتا ہے کہ قرآن ناقابل فہم کتاب ہے' یا علماء سے بد ظن ہو جاتا ہے کہ وہ قرآن کو ہمارے لئے کیوں عام نہیں بنا سکے' یا خود علماء سے الگ قرآن سمجھنے کی کوشش میں لگ کر کسی جدید گمراہ فرقے کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ اس میں قصور بیچارے قرآن پڑھنے والے کا نہیں ہے ہمارا ہے کہ قرآن تو عام آدمی کے لئے کتاب ہدایت ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور علماء قرآن آج کل اس کو عوامی سطح تک پہنچانے میں ناکام رہے ہیں۔

قرآن کو سمجھنے والے یہ قرض جتنا جلد ادا کریں گے عوام کے لئے قرآن فہمی اتنی ہی آسان ہو جائے گی اور عوامی شعور اور بیداری کی ایک ایسی لہر پیدا ہو گی جو بالآخر اسلام کی آغوش میں پناہ لے گی۔ آج قرآن کے جاننے والے لوگ قرآن اور حق کے متلاشی عوام میں کس کس طرح سے رکاوٹ بن رہے ہیں اس کے لئے ایک واقعہ ہی کافی ہے جو ہر باشعور انسان کو لرزا دیتا ہے۔

پچھلے دنوں ایک صاحب نے بتایا کہ کوئٹہ کے کسی تعلیمی ادارے میں ایک ہندو نوجوان نے پڑھنے کے لئے قرآن مجید ایشو کرالیا۔ چند دن تو اس بات کا پتہ نہیں چلا' جیسے ہی یہ بات عام ہوئی ایک شدید ہنگامہ کھڑا ہو گیا اور قرآن فوراً اس نوجوان سے واپس لے کر لائبریری میں رکھ دیا گیا اور نوجوان کو مناسب سزا بھی دی گئی۔ اِنَّ فِی ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ!

قرآن جو ہے ہی لوگوں کی ہدایت کے لئے اور متلاشیانِ حق کے لئے اس کے دروازے متلاشیان پر ہی بند کر دیئے گئے۔ اس واقعہ کے کوئی دیگر عوامل بھی ہوں تو مجھے معلوم نہیں مگر نفس واقعہ سے جو بات عیاں ہے وہ آج کے مسلمان کے مزاج کے عین مطابق ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے لمحۂ فکریہ ہے کہ آج ہم مسلمان قرآن مجید کو مخلوقِ خدا تک پہنچا رہے ہیں' یا اس کے ابلاغ کے راستے کا پتھر بنے ہوئے ہیں۔

آج کی ضرورت قرآن کو قرآن سے سمجھنے کا کوئی عام اسلوب ہے۔ اس کے لئے ماضی قریب میں لوگوں نے جانفشانی کی ہے اور کام کیا ہے' ان کا کام کوئی حرف آخر نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دل کھلا کر کے خذ ما صفا ودع ما کدر "جو صاف اور اچھا ہے وہ لے لو اور جو برا اور غیر مصفی ہے اسے چھوڑ دو" کے مصداق اس میں سے حق تلاش کیا جائے اور اسے own کیا جائے اور حدیثِ رسالت مآب ﷺ ((اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ هُوَ اَحَقُّ بِهَا حَيْثُ وَجَدَهَا)) کے مصداق اس میں کسی تعصب کو قریب نہ آنے دیا جائے تاکہ قرآن کے علوم عوام اور خواص تک پہنچ سکیں۔

اللہ کرے کہ "خیریتِ تعلّم و تعلیمِ قرآن" کی تشریح میں بیان کی جانے والی ذمہ داریاں واضح ہو گئی ہوں اور ہم سب اپنے اپنے حصے کا کام سنبھالنے پر آمادہ ہو جائیں تاکہ قرآن فہمی کی ایک عام رو چل سکے جس سے قرآن کے منبع ایمان اور سرچشمہ یقین ہونے کے سبب ایمان کی ایک فصل لہلہائے گی اور ایمان کی اس بہار کے سبب کیا عجب کہ اسلام کی عالمی غلبے کی نوید کی سنہری سحر کا وقت قریب آ سکے۔

یعنی اس کٹھن کام میں حصہ لینے والے ہی دراصل فرمان رسالت ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهُ)) "تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جو قرآن کا علم حاصل کریں اور (آگے) تعلیم دیں" کے مطابق بہترین لوگ ہو سکتے ہیں اور واقعتاً آج کے دور میں اس سے بہتر کوئی Career نہیں اور اس سے بہتر کوئی مصروفیت نہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق بخشے کہ ہم اپنی زندگیاں قرآن کریم کی خدمت اور اس کے علوم کی ترویج و اشاعت میں لگا سکیں۔ آمین

ایں سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

انسانیت کا محسنِ اعظم ﷺ

علاؤالدین احمد شمس صدیقی ندوی

وہ کیسی مبارک گھڑی تھی جب جناب عبدالمطلب نے مرحوم بیٹے عبداللہ کے بعد از وفات پیدا ہونے والے بیٹے کا نام محمدؐ تجویز کیا۔ آنحضورؐ کا یہ پہلا نام دادا نے نیک شگون کے طور پر محمدؐ یعنی بے انتہا قابل تعریف رکھا تھا۔ خالق کائنات کو اس یگانہ روزگار، دانائے راز، حامل دانش نورانی نبی امی سے وہ کام لینا تھا جو ابتداء آفرینش سے لے کر اُس وقت تک کسی پیغمبر سے انجام پذیر نہیں ہوا تھا۔ اس نبی اُمّی سے پہلے ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر مبعوث ہوئے اور اپنے اپنے دائرۂ عمل میں اپنی اپنی قوموں کو ان کے فہم و شعور کے مطابق رشد و ہدایت کا فرض انجام دیتے رہے۔

ابتداء آفرینش میں انسان کا شعور عالم طفولیت میں ہونے کی وجہ سے مظاہر پرست تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب آسمان پر ستاروں کو جگمگاتے دیکھا تو فرمایا ﴿ هٰذَا رَبِّیْ ﴾ لیکن جب ستارے ڈوب گئے تو فرمایا ﴿ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِیْنَ ﴾ کہ میں ڈوبنے والوں کو پسند نہیں کرتا ـــــ اسی طرح چاند اور اس کے بعد سورج کے غروب ہونے پر اعلان کیا: ﴿ یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ ﴾ "اے میری قوم! میں اس شرک سے اعلان براءت کرتا ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔" ﴿ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ﴾ "میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

انسان کی فطرت میں خالق کا تصور ابتداء آفرینش سے ہے لیکن وہ اپنے پیدا کرنے والے کو مجسم شکل میں دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن فہم و شعور کی ناپختگی اور نور بصیرت کی محرومی کی وجہ سے شخص و عکس، حقیقت و مجاز اور ذات و صفات میں تمیز نہ کر سکا۔ جس طرح چکور چاند کے عکس پر، اصل چاند سمجھ کر، پانی میں چونچ مارتا ہے، حالانکہ اصل چاند آسمان پر تاروں کی محفل سجائے دنیا پر نور پاشی کر رہا ہوتا ہے۔ حکیم الامت اقبال نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" میں آدم کی پیدائش سے لے کر حضور سرور عالم ﷺ کی بعثت تک انسان کے شعور و فہم کی ناپختگی، گمراہی اور خود فریبی کی کتنی جامع اور مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہم سے پہلے تھا عجب تیرے جہاں کا منظر کہیں معبود تھے پتھر کہیں مسجود شجر

خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر مانتا پھر کوئی اَن دیکھے خدا کو کیونکر؟

اور یوں دیوی دیوتاؤں اور بتوں کی پرستش کسی خام خیالی اور فریب کی وجہ سے شروع ہوئی۔ علامہ فرماتے ہیں ؎

ذوقِ حضور در جہاں رسمِ صنم گری نہاد عشق فریب می دہد جان امیدوار را

ایک چھوٹے بچے سے اگر پوچھیں کہ بچے! کیا تمہاری ماں تمہیں پیار کرتی ہے؟ تو وہ پیار کے ثبوت میں کہے گا کہ میری ماں مجھے مٹھائی، حلوہ، بسکٹ اور پھل دیتی ہے۔ بچہ ان چیزوں کے آئینہ میں ماں کی محبت اور پیار کو دیکھتا ہے۔ حالانکہ ان چیزوں اور مٹھائی کا اصل سرچشمہ اور ماں کی مامتا کا اصل شیریں محل ماں کا سینہ ہے، جہاں یہ مٹھائی تنزیہی شکل میں تھی۔ پھر تشبیہی اور مادی شکل میں بچہ کو ملی۔ لیکن یہی بچہ جب جوانی اور شعور و ادراک کی منزل میں پہنچ جاتا ہے اور کہیں دور سفر میں تعلیم کے لئے یا مجاہد بن کر میدان جنگ میں جانے کے لئے ماں سے رخصت ہوتا ہے تو ماں کی آنکھوں کے آنسوؤں کے چند قطرے، جو ماں کے سینہ کے سمندر سے چھلک کر رخساروں پر بکھر جاتے ہیں، یہ اس تلاطم اور طوفان کے نمائندے ہیں۔ یہ پیام درد دل ہے جس کو یہ جوان چشم ظاہر کے ذریعہ دل بینا سے دیکھ رہا ہے ؎

از اشک مپرسید کہ در دل چہ خروش است
ایں قطرہ ز دریا چہ خبر داشتہ باشد

یہ ایک حیران کن حقیقت ہے کہ آج انسان جدید علوم و فنون اور سائنسی ترقی کی وجہ سے انتہائی روشن دماغ، حقیقت شناس اور کائنات کا رازدان بنتا جارہا ہے۔ بقول اقبال ؎

ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی
وہ مُشتِ خاک ہوں فیض پریشانی سے صحرا ہوں
نہ پوچھو میری وسعت کی، زمیں سے آسماں تک ہے!

لیکن اس کے باوجود کروڑوں انسان ابھی تک فہم و بصیرت کے اعتبار سے عالم طفولیت میں ہیں۔ ہندوستان، چائنا، سری لنکا، اور کئی ممالک کے باشندے ابھی تک بت پرستی میں مبتلا دیوی دیوتاؤں کے مجسموں کے پجاری ہیں، یہاں تک کہ جنوبی ہند میں ذریعہ پیدائش لنگ (عضو تناسل) تک کی پوجا کی جاتی ہے اور خوگر پیکر محسوس آنکھیں ابھی تک فریب نظر میں مبتلا ہیں۔

اس لئے آدم کی ہدایت اور تربیت کیلئے خالق کائنات نے زبور، تورات، انجیل اور صحائف

پیغمبروں پر نازل کئے۔ ہر ایک پیغمبر نے اپنی قوم کے شعور اور فہم کے تدریجی ارتقاء کے مطابق پیغام ربانی کی تلقین کی اور جب انسان کا فہم عالم طفولیت سے نکل کر شعور و بصیرت کے لحاظ سے پختہ اور بالغ نظر ہو گیا تو خالق کائنات نے آخری رسول خاتم النبیین حضور سرورِ عالم ﷺ کو مبعوث فرمایا اور ان پر انسانی تعلیمات کی آخری کتاب نسخۂ کیمیا اور انفرادی اور اجتماعی زندگی پر مشتمل آئین زندگی نازل فرمایا۔ اس حقیقت کا اعتراف تو غیر مسلم مفکرین نے بھی کیا اور لندن کے مشہور قانونی ادارہ "لنکن اِن" کے دروازہ کی پیشانی پر دنیا کو پہلی بار انسانی زندگی کو آئین زندگی دینے والے حضور سرورِ عالم ﷺ کا نام جلی حروف میں درج ہے۔

اس آئین زندگی اور کتاب ہدایت میں تعلیمات و ارشادات' احکامات اور مسائل زندگی پر مشتمل قرآن کے علاوہ ایک اور قرآن کی جانب بھی اللہ نے توجہ دلائی ہے اور وہ قرآن صحیفہ کائنات یعنی یہ دنیا ہے۔ قرآن میں نماز روزہ' حج' زکوٰۃ اور مسائل زندگی سے متعلق احکامات کے لئے ڈیڑھ سو آیات ہیں' لیکن مظاہر فطرت کے مطالعہ اور غور و فکر کی دعوت کے لئے سات سو چھپن آیات نازل ہوئی ہیں۔ مثلاً ارشاد ہے :

﴿ اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ○ ﴾ (آل عمران : ۱۹۰)

"بے شک زمین و آسمان کی تخلیق میں اور دن اور رات کے اختلاف میں صاحبان عقل و خرد کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔"

ایک اور جگہ فرمایا :

﴿ وَكَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یَمُرُّوْنَ عَلَیْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ○ ﴾ (یوسف : ۱۰۵)

"زمین اور آسمانوں میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ لوگ گزرتے رہتے ہیں اور ذرا بھی توجہ نہیں کرتے۔"

ایک اور مقام پر فرمایا :

﴿ وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ○ وَفِیْ اَنْفُسِكُمْ' اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ ﴾

"زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے۔ اور خود تمہارے اپنے وجود میں بھی۔ کیا تم کو سوجھتا نہیں؟" (الذاریات : ۲۰'۲۱)

ایک اور جگہ فرمایا :

﴿ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۝ ﴾ (قٓ : ۱۶)

''اور ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں''

یہ ایک ابدی حقیقت ہے کہ کائنات کی ہر شے کی روح' حقیقت اور جوہر پردہ پوش ہے۔ جہاں کہیں آثارِ حیات ہیں اس کا سرچشمہ ضمیر کائنات خالق کائنات ہے۔ خود انسان بھی جن اشیاء کا خالق یا موجد ہے ان کی قوت تخلیق بھی پوشیدہ ہے۔ جس طرح بجلی کا کرنٹ اپنے ظہور کیلئے بلب یا ٹیوب کا محتاج ہے' لیکن بلب روشنی کیلئے کرنٹ کا محتاج ہے۔ لہٰذا مصنف کو تصنیف میں' شاعر کو شعر میں' موجد کو اپنی ایجاد میں اور مصور کو تصویر میں دیکھو۔ اسی طرح خالق کائنات اس عالم رنگ و بو کے ذرہ ذرہ میں جلوہ گر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رَبِّ اَرِنِیْ کہہ کر خالق کو دیکھنے کی تمنا کی' جواب ملا لَنْ تَرَانِیْ۔

اقبال کہتا ہے: اے خالق کائنات' میرے معبود ؎

اے چو جاں اندر وجودِ عالمی جانِ ما باشی و از ما می رومی

پرِ توِ حسن تو می افتد بروں مانند رنگ صورت مے پردہ از دیوار مینا ساختی

علامہ اقبال ذوق حضوری کا سبب فرماتے ہیں ؎

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں

کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

آج دنیا میں سائنس اور موجودہ علوم و فنون زمین و آسمان کی لامحدود وسعتوں میں پھیلے ہوئے صحیفۂ کائنات کے مختلف اور بے شمار شعبوں کے مطالعہ' تحقیقات' تفصیلات' تشریحات اور رپورٹوں کا مجموعہ ہی تو ہیں۔ دنیا کا یہ سب موجودہ سرمایۂ علم و فن فکر انسان کی جستجو' کاوش' تلاش اور سفرنامے ہی تو ہیں اور انہی علوم و فنون کی بدولت انسان اپنی بقا و حفاظت کا سامان مہیا کر رہا ہے۔ یہ علوم و فنون انسانی زندگی کے خانہ زاد خدمت گار اور پیش دست ہیں۔

یہ نہایت قابل قدر اور لائق صد ہزار تحسین و تعریف کارنامہ محمد ﷺ انسانیت کے محسن اعظم کا' کہ آپؐ نے چشم بینا' عقل و خرد کی رہنمائی اور دل بینا کی روشنی میں حقائق حیات کو سمجھنے اور غور و فکر کرنے کیلئے انسانی شعور کو جوان اور بالغ نظر بنا دیا ہے۔ بقول مولانا ظفر علی خان مرحوم ؎

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا

وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

انسان کیلئے حضورؐ کی اس عطا کے کارنامہ کو ایک شعر میں علامہ اقبال نے کیا خوب بیان کیا ہے ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے، تو نہیں جہاں کے لئے

یہ کائنات انسان کے لئے منازل ارتقاء کی آئینہ دار ہے اور اسی کی کتاب زندگی کی تفسیر ہے۔

بقیہ : علامہ اقبال کے افکار و خیالات

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

وہ افراد جو شرح صدر کے ساتھ کہہ سکیں کہ ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ○ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ○﴾

اب دونوں چیزیں آپ کے سامنے ہیں، انجمن خدام القرآن بھی اور تنظیم اسلامی بھی۔ اس میں حصہ لینا یا نہ لینا آپ کے اختیار میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو بھی کسی دوسرے پر اختیار نہیں دیا۔ یہاں تک کہ خود رسول اللہ ﷺ سے صاف کہہ دیا ﴿اِنَّکَ لَا تَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ﴾ "اے نبی آپ کے اختیار میں نہیں ہے کہ جس کو چاہیں ہدایت دے دیں، وہ تو اللہ ہی ہے جو جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے"۔ ہمارا کام یہ ہے کہ پورے تاریخی پس منظر کے ساتھ پوری جدوجہد کو آپ کے سامنے رکھ دیں۔ آگے آپ اس میں کس قدر حصہ لیتے ہیں اور کتنا آگے بڑھتے ہیں یہ فیصلہ آپ نے کرنا ہے، ہر شخص کی اپنی محنت ہے، اپنی کمائی ہے۔ بالفاظ قرآنی ﴿لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ○ وَاَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی﴾ اللہ تعالیٰ آپ کو حصول رضائے الٰہی کی توفیق عطا فرمائے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

تعارف و تبصرہ

المرتضٰی کرّم اللہ وجہہ

تصنیف : مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

صفحات : ۴۸۰، قیمت : ۳۰۰ روپے، آرٹ پیپر

ناشر : مکتبہ سید احمد شہیدؒ۔ ۱۰ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔

"المرتضٰی" امیر المومنین سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی سیرتِ مطہرہ کا ایک جامع اور مبسوط تذکرہ ہے ـــــ سیدنا علی مرتضٰی رضی اللہ عنہ اپنے ذاتی محاسن، خاندانی پس منظر اور دینی و اخلاقی اوصاف و کمالات کے حوالے سے تاریخ اسلام بلکہ تاریخ عالم کی ایک عہد آفرین اور اُولوالعزم شخصیت ہیں۔ پروردگارِ کائنات نے آپؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عم زاد بنایا، آغوشِ نبوی میں پروان چڑھے، کفر و شرک کی نجاست سے آپؓ کا دامنِ فکر و نظر کبھی آلودہ نہ ہوا، بچوں میں سب سے پہلے آپ ہی ایمان لائے۔ شب ہجرت کے زہرہ گداز لمحات میں آپؓ ہی کو سریر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر استراحت کا شرف حاصل ہوا، سفر ہجرت میں محض حکمِ نبی کی تعمیل میں آپؓ آبلہ پا ہوئے اور قبا میں رسول رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ شفا سے لعاب شفا لگوا کر شفایاب ہوئے۔ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا کی زوجیت سے آپ کو دامادِ نبی ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہوا۔ بدر و اُحد، احزاب و خیبر، اور معرکۂ مکہ و حنین آپ کی شجاعت و بسالت کے داستان سرا ہیں۔ مدینہ علم و حکمت کی باب کشائی آپؓ کے ہاتھوں انجام پائی ہے۔ الجھے معاملات اور حیرت انگیز مشکلات آپؓ ہی کے ناخنِ تدبیر سے وا ہوتی ہیں۔

یہ علیؓ ہیں جو صدیقیؓ کارناموں کے وزیر و مشیر بنے ـــــ یہ علیؓ ہیں جن کے بارے میں سیدنا عمرؓ کی زبان مبارک سے بے ساختہ نکلا تھا : "اگر علی نہ ہوتے تو عمر تو برباد ہو گیا ہوتا" ـــــ یہ علیؓ ہیں جو آخری لمحوں تک خلافت عثمانیؓ کے تحفظ و بقا کے لئے کوشاں رہے۔ یہ بھی علیؓ ہی ہیں جنہوں نے اپنے دورِ خلافت میں خلافت کی گاڑی کو منہاج نبوت سے ہٹنے نہیں دیا ـــــ یہ بھی علیؓ ہی ہیں جن کی سیاست ہر کثافت سے پاک رہی۔ یہ بھی علیؓ ہی ہیں جو تند و تیز آندھیوں میں سنت کا چراغ جلائے رہے اور عداوتوں اور مخالفتوں کے طوفان میں عدالت کا علم تھامے رہے۔

ارشادِ نبویؐ کے مطابق آپؓ میں سیدنا عیسٰی علیہ السلام کی بھی کچھ شان پائی جاتی ہے کہ آپؓ کے حوالے سے کچھ لوگ آپؓ سے محبت و عقیدت میں غلو کرنے کی وجہ سے گمرہ ہوئے اور کچھ

لوگ بغض و نفرت کی وجہ سے برباد ہوئے ـــــ امت کو آپؓ کی شخصیت کے بارے میں اس افراط و تفریط سے بچانے کے لئے ہر دور میں علمائے حقّانی نے لسانی و قلمی مساعی کی۔ لیکن کم ترک الاولون للاخرین۔ ابھی تشنگی باقی تھی اور ایک عرصے سے یہ ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ کوئی ایسا مردِ میدان آئے جو اس عظیم شخصیت کے احوال و مناقب اور آپؓ کے دورِ خلافت کے بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز حالات و واقعات کا ہمہ گیر تجزیہ تحقیق کی کسوٹی پر کس کر اور اعتدال کی چھلنی میں چھان کر پیش کرے۔ آخر وہ مردِ میدان آیا اور انہی کی آل سے آیا۔ وہ آیا اور اپنے مورث اعلیٰ سید ابوالحسن علیؓ کا ہم نام ہو کر آیا اور اپنی خاندانی روایات کا امین بن کر آیا۔ میدان تحقیق میں کہیں اس کا رہوارِ قلم جادۂ اعتدال سے ڈگمگاتے نہیں پایا۔ اس کے کسی جملے سے عدالت کا دامن مجروح نہیں ہوا، کسی کی حرمت پر حرف نہیں آیا اور کسی کا آبگینۂ دل ٹوٹنے نہیں پایا۔

"المرتضیٰؓ" کیا ہے؟ سنت کی دلکش کرنوں کا ایک حسین پرتو ہے ـــــ الجماعت کے جلو میں تاریخ کا ایک ایمان افروز سفر ہے ـــــ تحقیق و تجزیہ کا ایک اعلیٰ اور نرالا معیار ہے ـــــ استنباط و استدلال کا ایک نیا اور محکم اسلوب ہے ـــــ "المرتضیٰؓ" کی ایک ایک سطر سے محبت کے نغمے اور ایک ایک لفظ سے محنت کے زمزمے سنائی دیتے ہیں ـــــ "المرتضیٰؓ" مصنّف کے بڑھاپے کی ایک جوان تحریر ہے۔ اس کتاب میں جادۂ تحقیق پر جوانی کا جوش اور بڑھاپے کا ہوش ہم قدم دکھائی دیتے ہیں۔ یقیناً جوش اور ہوش کے اس حسین امتزاج کی بدولت مصنف اس نازک اور بھاری موضوع سے نہایت حسن و خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ہیں۔

المرتضیٰ" دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب کے عنوانات سے کتاب کی جامعیت کا آسانی سے اندازہ ہو جاتا ہے ـــــ پہلا باب: خاندان، پیدائش، ہجرت کی تفاصیل پر محیط ہے ـــــ دوسرا باب: ہجرت سے وفاتِ نبویؐ تک کے حالات پر حاوی ہے ـــــ تیسرا باب: حضرت علیؓ عہدِ صدیقیؓ میں ـــــ چوتھا باب: حضرت علیؓ عہد فاروقیؓ میں ـــــ پانچواں باب: حضرت علیؓ عہدِ عثمانیؓ میں۔

چھٹا باب: حضرت علیؓ اپنے دورِ خلافت میں، اس باب میں مصنف نے اس عہد کی پیچیدگیوں اور دشواریوں، اختلافات کی ابتدا، جنگ جمل، جنگ صفین، تحکیم، خوارج اور سبائیہ، مشاجرات صحابہؓ پر نہایت حزم و احتیاط اور اعتدال کے ساتھ بحث کی ہے۔ ان تمام واقعات سے اُمت کو جو سبق حاصل ہوتا ہے مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ اسے اُجاگر کیا ہے ـــــ ساتواں باب: خوارج اور اہل شام سے مقابلہ، اہل عراق اور اہل شام کے درمیان طبائع کا فرق، حضرت علیؓ کی

شہادت، آل اولاد، حکمت و بلاغت، اشعار اور آپؓ کا منفرد اسلوب اس باب کے اہم مباحث ہیں ـــــ آٹھواں باب : اس باب میں حضرت علیؓ کا طرزِ حکومت اور آپؓ کے اصولِ سیاست تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اسی ضمن میں حضرت معاویہؓ کے طرزِ عمل اور اُس دور کے اسلامی معاشرے کا نہایت خوبصورت تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان حقائق سے آگاہ ہونے کے بعد انسان بہت سی الجھنوں سے نکل آتا ہے۔ اسی باب میں حضرت علیؓ کی شخصیت کے چند تابناک پہلوؤں کو بھی نہایت محبت و احترام کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔

نواں باب : اس باب میں امام حسن اور امام حسین رضی اللہ عنہما کے حالات اور کارناموں کو بیان کیا گیا ہے ـــــ امام حسنؓ کی حضرت معاویہؓ کے ساتھ صلح اور اس کے اثرات، حضرت حسینؓ کی تاریخی جدوجہد، حادثۂ کربلا، حسینی اقدام کے محرکات اور تاریخ اور امت پر اس کے نقوش، یزید کا کردار، کبارِ اہل سنت کا اس حادثے کے بارے میں موقف اس باب کے اہم مباحث ہیں۔ اس باب کے مطالعے سے بہت سی غلط فہمیاں اور تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں ـــــ دسواں باب : حضرات اہل بیتؓ اور اولاد علیؓ کی پاکیزہ سیرتوں کے بیان کے لئے وقف ہے۔ اس باب میں ان مقدس شخصیتوں کی دعوت و عزیمت کی ایمان افروز تاریخ رقم ہوئی ہے۔

آخر میں مصنف نے بالکل بجا طور پر فرقہ اثنا عشریہ کے عقیدۂ امامت، اس عقیدے کے نفسیاتی محرکات، قدیم ایران اور اس کے عقائد کا اس عقیدے پر اثر کے حوالے سے بحث کی ہے اور اس کا حق ادا کیا ہے۔ بالکل آخر میں مصنف نے خلفائے اربعہ رضی اللہ عنہم کی خلافت کے بارے میں ایک جامع نوٹ لکھا ہے۔ اس میں مصنف نے نہایت خوبی کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ خلفائے اربعہؓ کی عالمِ ظہور میں ترتیبِ خلافت فطرت کے عین مطابق ہے اور خلافت راشدہ کے ادوار اربعہ کا مزاج و منہاج بالکل یکساں ہے۔ تکوینی طور پر یہ ادوار جس ترتیب سے ظہور پذیر ہوئے ان کو اسی ترتیب ہی سے آنا چاہئے تھا اور یہی ہر دور کا تقاضا تھا۔

مصنف نے یہ کتاب عربی میں تحریر فرمائی ہے۔ اردو ترجمہ جناب ڈاکٹر عبداللہ عباس معتمد تعلیمات دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ نے نہایت مہارت و لیاقت کے ساتھ کیا ہے۔ اس کتاب کے عربی متن کے تین ایڈیشن دمشق سے، اردو ترجمے کے تین سے زیادہ ایڈیشن لکھنؤ، کراچی اور لاہور سے اور انگریزی ترجمے کا ایک ایڈیشن لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ اصل کتاب ریڈیو مصر سے بھی لفظ بہ لفظ نشر ہو چکی ہے۔ اب مکتبہ سید احمد شہیدؒ، جو مصنف کے جدِّ اعلیٰ کے نام پر ہے، حسبِ روایت اعلیٰ طباعت کے ساتھ یہ کتاب شائع کر رہا ہے۔ ٹائٹل حضرت سید نفیس الحسینی مدظلہٗ کی نفاستِ قلم کا شاہکار ہے۔ (تبصرہ نگار : ظفر اللہ شفیق، ایچی سن کالج، لاہور)

بعثتِ انبیاء و رسل کا اساسی مقصد ——— اور
بعثتِ محمدی کی تمامی و تکمیلی شان ——— نیز
انقلابِ نبوی کا اساسی منہاج ———

ایسے اہم موضوعات پر

——— ڈاکٹر اسرار احمد ———

کی

حد درجہ جامع تصنیف

نبی اکرم ﷺ کا مقصدِ بعثت

کا مطالعہ کیجیے

اشاعتِ خاص	(اعلیٰ سفید کاغذ مجلّد)	-/۲۴ روپے
اشاعتِ عام	(نیوز پرنٹ غیر مجلّد)	-/۱۰ روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

Aug. 1998 Reg. No. CPL. 126
Vol. 17
MONTHLY
Hikmat-e-Quran
LAHORE
No. 8

قرآن اکیڈمی لاہور کے

ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس

میں داخلے جاری ہیں

یہ کورس بنیادی طور پر ان احباب کیلئے تشکیل دیا گیا ہے جو اپنی دنیاوی تعلیم مکمل کر چکے ہوں اور بنیادی دینی تعلیم بالخصوص، قرآن حکیم کی درست تلاوت اور اس کے مفہوم کو سمجھنے کی خاطر تجوید سیکھنے اور عربی گرامر کی پختہ بنیادوں پر تحصیل کے خواہاں ہوں ـــــ چنانچہ اس میں داخلے کے لئے گریجویشن تک تعلیم کا ہونا ضروری ہے۔ استثنائی حالات میں ایف اے پاس امیدوار کی درخواست پر بھی غور ہو سکتا ہے۔

داخلہ فارم جمع کروانے کی آخری تاریخ 31/اگست ہے۔

- انٹرویو 5 ستمبر کو صبح نو بجے ہوں گے، اور
- تدریس کا آغاز 7 ستمبر سے ہو گا۔ ان شاء اللہ
- تفصیلات کے لئے پراسپکٹس طلب کریں۔

المعلن :

ناظم قرآن کالج، 191۔ اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

فون : 5833637